ڈیوڑھی

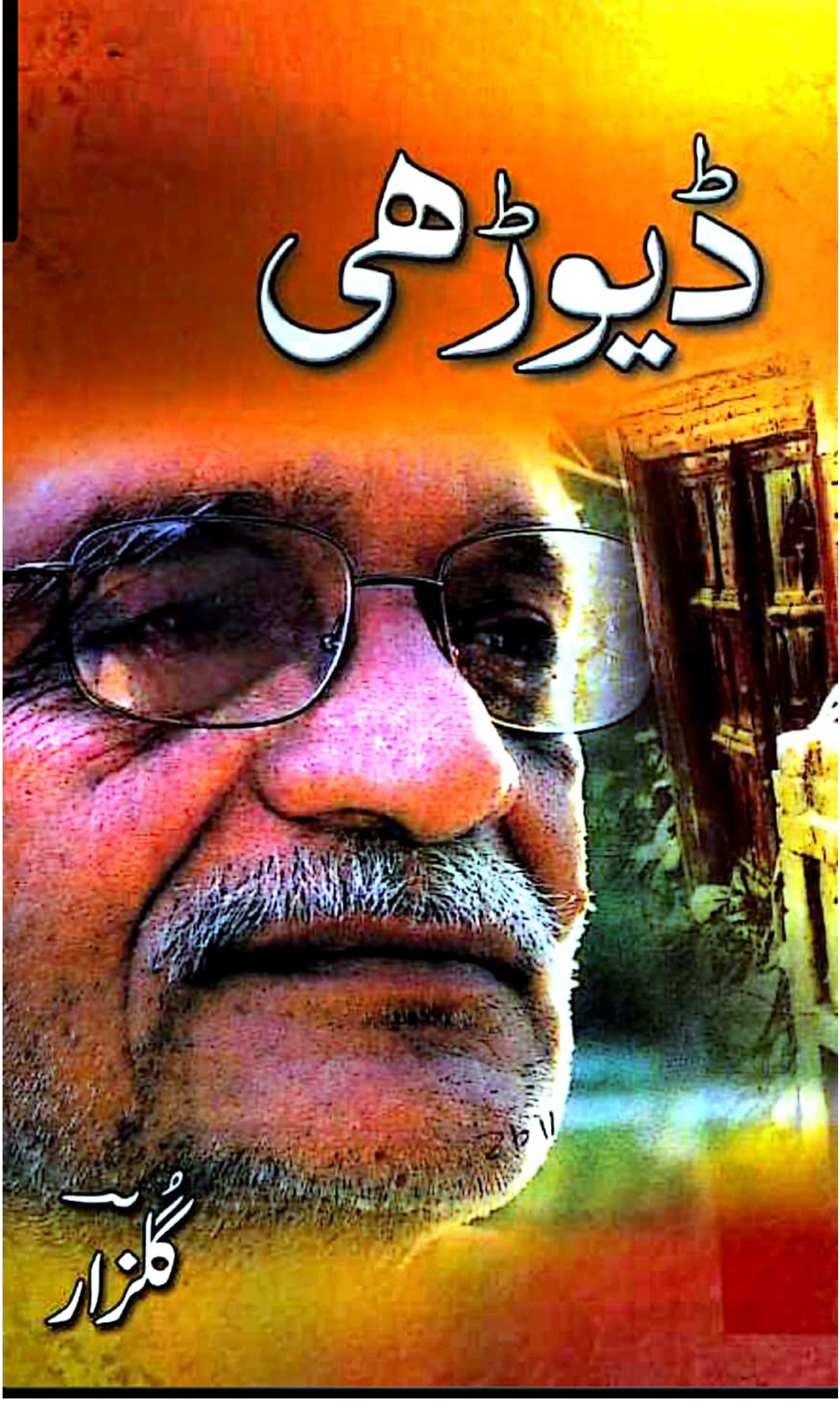

گلزار

Scanned by CamScanner

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

Scanned by CamScanner

ڈیوڑھی

افسانے

گلزار

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Scanned by CamScanner

میرے ہموطن دو ــــــ

جناب ظفر حسن ــــــ لاہور

اور

جناب حَسن ضیا ــــــ کراچی

اُن کے نام!

Scanned by CamScanner

891.4393 Gulzar
Devdhi/ Gulzar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2013.
207pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

© گلزار

2013ء

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

ISBN-10: 969-35-2678-3
ISBN-13: 978-969-35-2678-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

Scanned by CamScanner

فہرست

نمبر	عنوان	نمبر	نام	صفحہ نمبر
1۔	کتابوں سے کبھی گزرو تو یوں کردار ملتے ہیں، گئے وقتوں کی ڈیوڑھی میں کھڑے کچھ یار ملتے ہیں!			17
		1	ساحر اور جادُو	19
		2	کلدیپ نیّر اور پیر صاحب	25
		3	بھوشن بنمالی۔	32
2۔	ہے سر پانی میں اور پاؤں زمیں پر ___ یہ نگری ممبئی کی ہے ___!			47
		1	باس	48
		2	جھڑی	53

Scanned by CamScanner

		3	سارتھی	61
		4	فٹ پاتھ سے	68
3۔	آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا، سپنوں کی سرحد ہوتی نہیں بند آنکھوں سے روز میں سرحد پار چلا جاتا ہوں ____!			75
		1	ایل۔او۔سی	76
		2	اوور	84
		3	ڈمپ	93
4۔	اتنے سارے بازو، ٹانگیں، ہاتھ اور سر اور پاؤں بچے کھچے پُرزے لگتے ہیں، 'سپیئر پارٹز' ہیں!			101
		1	ہلسا	102
		2	دی سٹون ایج	108
		3	تلاش۔	116
5۔	ایک خیال نہ دِکھتا ہے، نہ چُپ ہوتا ہے ذہن کے سناٹے میں اِک جھینگر ہے، بولتا رہتا ہے ____!			130
		1	سوئمبر	131
		2	وِداعی	138

Scanned by CamScanner

144	اٹھنیاں	3		
155	بڑا ہونے لگا تھا، پھر خیال آیا میں پوچھوں تو سہی، کتنا ضروری ہے بڑا ہونا ____!			6
156	گاگی اور سپرمین	1		
162	گھگو اور جامنی	2		
167	نارنگی	3		
171	دوڑ دوڑ کے قدم ملاتا ہوں، زندگی یہ کتنی تیز چلتی ہے __!			7
172	مٹی تلے	1		
176	شورٹ کٹ	2		
183	گرہ کٹ	3		
188	پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرا آری سے کٹتے نہیں نابھی کے رشتے __!			8۔
189	سانجھ	1		
196	داداجی	2		

Scanned by CamScanner

201	ایڈجسٹمینٹ	3		

Scanned by CamScanner

ابتدائیہ

خیر میں گلزار صاحب کے معاملہ میں اس مقام تجسس سے تو گذر لیا ہوں کہ جب اس ذہن رسا نے فلم کی اقلیم میں اتنے علاقے تسخیر کر لئے اور قریب و دور سے ملنے والی داد سے دامن بھر گیا تو پھر ایسی کونسی تشنگی بے چین کر رہی تھی کہ اپنی اقلیم سے نکل کر ادب کی چراگاہ کا رخ کیا اور اس سرگرمی کے ساتھ کہ شاعری اور افسانہ دونوں میں قلم رواں ہے۔ مگر جب افسانے پڑھ لئے تو تجسس خود بخود دور ہو گیا۔ اگر کوئی ہنرمند اپنے میدان سے نکل کر کسی دوسرے میدان میں بھی اسی شان سے جوہر دکھائے تو یہ سرخروئی خود ہی اس کے اس اقدام کا جواز بن جاتی ہے۔

اب میری حیرانی یہ ہے کہ یہ افسانہ نگاری کا کون سا انداز ہے کہ اچھے بھلے جیتے جاگتے لوگوں کی یہاں آ کر اس طرح کایا کلپ ہوتی ہے کہ وہ افسانوی کردار بن جاتے ہیں اور واقعاتی بیان دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں افسانے کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ کمال سب سے بڑھ کر 'بملدا' عنوان والی کہانی میں نظر آتا ہے۔ یہ تو ہمیں جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ بملدا کوئی افسانوی کردار نہیں ہے۔ دنیائے فلم کی جانی مانی شخصیت ہے

Scanned by CamScanner

اور جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ بھی واقعاتی بیان ہی نظر آتا ہے۔ مگر یہ بیان کچھ اتنی آہستگی سے افسانوی سانچے میں ڈھلتا ہے کہ جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو بملد اکسی ناول کے بڑے المیہ کردار کے طور پر احساس تحیر پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اداس بھی کرتا ہے۔ افسانے کے ختم کے بعد بھی ہمارے اردگرد اداسی کی یہ کیفیت منڈلاتی رہتی ہے۔

آگے دو کہانیاں اور ہیں۔ 'ساحر اور جادو' اور 'کلدیپ نیر اور پیر صاحب'۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ گلزار کے بیان کی کرامات ہے کہ واقعات اس کے بیان میں ڈھل کر کہانی بن جاتے ہیں اور شخصیتیں اور اشخاص افسانوی کرداروں کا رنگ پکڑ لیتے ہیں۔ یا ایسے واقعات اور ایسے اشخاص جن میں کہانی بننے کے امکانات ہوتے ہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی گلزار کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ان کے بیان میں اپنی اصل ظاہر کر کے مکتی پا لیتے ہیں۔

مگر یہ بھوشن بنمالی کون ہے۔ میں کہانی پڑھتا جاتا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کمال بے تکلفانہ لہجہ میں کہانی لکھی ہے کہ لگتا ہے کہ یہ دوستوں کی کوئی ٹولی ہے جو پکنک پہ نکلی ہوئی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ سب اشخاص قصہ افسانوی کردار نہیں ہیں بلکہ سچ مچ کے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔ اور یہ بھوشن بنمالی گلزار صاحب کے دوستوں میں کوئی دوست ہے۔ اس کی اپنی ایک لنک ہے۔ مگر بیچ میں اچانک خیال آیا کہ بمبئی کی مخلوق سے میری کونسی ایسی شناسائی ہے۔ تو یہ بھیا یاروں دوستوں کا جمگھٹا ہے جب ہی تو اتنی بے تکلفی سے ان کا بیان ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ سب یار غار ہیں۔ آپس میں دانت کاٹی روٹی ہے۔ پھر آخر تک میں اسی شش و پنج میں رہا کہ یہ اصلی جیتے جاگتے لوگ ہیں یا گلزار کے قلم نے اپنا جادو جگایا ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اور دیکھو پہاڑوں کا سفر کس عمدگی سے بیان کیا ہے جیسے لکھنے والے کی عمر ہی پہاڑوں کی اوبڑ کھابڑ راستوں پر دھکے کھاتی گذری ہے۔ اور آخر میں ساری چہل پہل، ساری گہما گہمی غائب۔ سفر کا حاصل ایک گہری اداسی۔ زندگی آدمی کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتی ہے۔

ان کہانیوں میں عجب جادو ہے۔ زندگی جیسے دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے۔ کیا کیا

Scanned by CamScanner

رنگ بدلتی ہے۔ اصلی اور نقلی کا کیا گھال میل ہے۔ اچھی بھلی زندگی کی کس طرح کایا کلپ ہوتی ہے کہ کہانی بن جاتی ہے۔ خود آدمی کس طرح کہانی بنتا ہے۔ اور ہاں یہ جو لوگ دیکھتے دیکھتے افسانوی کردار بن جاتے ہیں یا افسانوی کردار ہمیں جیتے جاگتے لوگ دکھائی دیتے ہیں ان میں ایک چیز مشترک ہے۔ وہ ہے ایک لٹک، بمل، ساحر، بھوشن، ہر ایک کی اپنی کوئی ایک لٹک ہے۔ اور ہاں افسانہ سانجھ میں جو لالہ جی ہیں۔

ان کی بھی تو ایک لٹک ہے۔ لالائن کو کیا سوجھی کہ بال کٹوا لئے ''لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بڑھیا نے بال کٹوا دیئے اور ان سے پوچھا بھی نہیں۔'' یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ ویسے تو بس اتنا ہی کہا کہ ''تمہارے بال تو بہت اچھے تھے۔ کٹوا کیوں دیئے۔'' پھر رک کر بولے ''اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔'' بیٹوں، بہوؤں نے سنا تو دگی پہ اتر آئے۔ لالہ کی کتنی عمر ہوگئی مگر مزاج وہی عاشقانہ چل رہا ہے۔

لالہ جی چپ۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ مگر پھر انہیں چپ لگ گئی۔ اور جیسے اسی کے ساتھ وہ آل اولاد سے بھرے گھر میں اکیلے رہ گئے ہیں۔ زبان پہ کچھ نہیں آیا۔ مگر اندر ہی اندر جیسے گھلے جا رہے ہوں۔ جیسے کوئی دکھ گھن کی طرح جان کو لگ گیا ہو۔ مگر گونگا دکھ ہے۔ کتنے دکھی لوگ رو پیٹ کر شکوے شکایات کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ لیکن ایک دکھ وہ بھی تو ہوتا ہے جو اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے۔ یہ ہوتا ہے گونگا دکھ۔ بس لالہ جی نے اتنا کہا کہ ایک دن اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا کہ بیٹی سے ملنے جا رہا ہوں۔ بیٹی سے ملنے کے بہانے جانے کدھر نکل گئے۔ بس ایک روز بدری ناتھ کے کسی آشرم سے ایک خط آیا جس سے سراغ ملا کہ وہ تو بدری ناتھ کے آشرم میں جا پدھارے ہیں۔ بیٹے فوراً باپ کی خبر لینے بدری ناتھ جا پہنچے۔ مگر لالہ جی تو ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بیکھنٹ کی طرف نکل گئے تھے۔ زندگی کا پھر وہی حاصل۔ ایک اداسی۔

ویسے ان کہانیوں میں بالعموم بمبئی کی خلقت نظر آتی ہے۔ وہ خلقت جس کا خود افسانہ نگار ایک رکن ہے جب ہی تو اتنی اپنائیت سے اور اتنا بے تکلفانہ ان کا ذکر ہوا ہے۔

Scanned by CamScanner

مگر یہ تو ایک بمبئی ہے۔ انہیں افسانوں میں رلے ملے وہ افسانے بھی تو ہیں جس میں ایک دوسرا ہی بمبئی نظر آتا ہے۔ بمبئی جو فٹ پاتھوں پر بکھرا پڑا ہے۔ سر چھپانے کے لئے جھونپڑیاں ہیں۔ وہ جو نظیر نے کہا ہے کہ ع

جو خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

زمین سے لگے خاک دھول میں اٹے یہ لوگ کیسے گذر بسر کرتے ہیں یہ جاننا ہو تو گلزار کی یہ کہانیاں پڑھو۔ پتہ چلے گا کہ بمبئی ایک نہیں ہے۔ ''ڈیوڑھی'' کی کہانیوں میں دو بمبئی واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک بمبئی عرش میں جھولتا ہے۔ دوسرے بمبئی کی مخلوق خاک چاٹتی ہے۔ اس مخلوق کو بھی گلزار نے خوب جانا سمجھا ہے۔ ذرا ایک نقشہ دیکھئے:

> ''رات کو اٹھا تھا پیشاب کرنے کے لئے۔ سڑک کے پار
> جا رہا تھا ریلوے لائن کی طرف۔ ادھر سے ایک کار آئی۔
> بہت تیز اور اڑا دیا۔ گرا جب اوپر سے نکل گئی۔ روکا بھی
> نہیں سالے نے۔ صبح میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ ادھر ادھر
> پوچھا۔ میں بولی نہیں۔ کیا کرتی کون جاتا پولیس میں۔
> اور پھر لاش لے کر جلاتا کون۔ میونسپلٹی کی گاڑی لے گئی۔
> جیسے شینڈی (کتا) کو گھسیٹ کے لے گئی۔ فٹ پاتھ کی
> زندگی سالی ایسی اپچ ہے۔''

مگر ان فٹ پاتھوں کی آغوش کھلی ہے۔ کتنی کتنی دور کی بستیوں سے نکھٹو خاک پھانکتے اس شہر میں آتے ہیں اور ان فٹ پاتھوں کی آغوش میں سما جاتے ہیں۔ چندو کو جھمرو نے بتایا

''ادھر دو قسم کا لوگ راج کرتا ہے۔ ایک تو پارٹی والا ہے۔ بھاشن دیتا ہے۔ نوٹ دیتا ہے۔ ووٹ لیتا ہے۔ دوسرا گولی چاقو چلانے والا ہے۔ مال دیتا ہے۔ جان دیتا ہے۔ کبھی جان لیتا ہے۔ مال دیتا ہے۔''

چندو کو نعرہ لگانے کے عوض پانچ اٹھنیاں ملی ہیں۔

Scanned by CamScanner

''پانچ ہفتے سونے کا بھاڑا ہو گیا نا۔''

''سونے کا ہو گیا۔ کھانے کا کیا کروں بھاؤ۔''

''کیا ہم بلایا تیرے کو۔ کون سے یوپی سے آیا۔''

بولا ''فیض آباد سے۔''

''پھیج آباد میں کون دیتا تھا کھانے کو۔ کیا؟ بول؟''

رزق تو قدرت پتھر کے کیڑے کو بھی مہیا کرتی ہے۔ تو رزق کمانے کے کتنے راستے ان کے لئے کھلے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا گذارہ سیاسی لیڈروں کے جلسوں پر ہے۔ سامعین میں شامل ہو کر جلسے کی رونق بڑھاؤ اور لیڈر کے حق میں نعرہ لگاؤ۔ ایک نعرہ ایک اٹھنی۔

پوچھتا ہے ''بھاؤ تم سارا حساب اٹھنیوں میں کیوں رکھتا ہے۔''

بھاؤ ادھا ہنس کے بولا ''اپنے جیسے کو من مین کے پاس سب کچھ آدھا ہی چ ہوتا ہے۔ آدھا کھانا' آدھا' پینا' آدھا سونا' آدھا ہنسنا' آدھا رونا' آدھا جینا' آدھا چ مرنا'..... یہ اٹھنی سالا کبھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔''

خاک میں پڑی اس رنگا رنگ مخلوق کا بیان اتنی جزئیات نگاری کے ساتھ ہے اور اتنے بے ساختہ انداز میں کہ یہ سب لوگ جیتے جاگتے ہماری نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔ بیان کی سادگی اس پر مستزاد۔ بلکہ ان کہانیوں کا ایک بڑا وصف یہی سادہ بیانی ہے۔ تجریدیت پسندوں نے کہانی کو معمہ بنا دیا تھا۔ گلزار صاحب نے کہانی کو پانی کر دیا۔ شاعری میں ایسے سہل اشعار کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ گلزار نے کہانی کو سہل ممتنع کر کے دکھایا ہے۔

انتظار حسین

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

کہانیوں کے کئی رُخ ہوتے ہیں۔ ایسی گول نہیں ہوتیں کہ ہر طرف سے ایک ہی سی نظر آئیں۔ سامنے، سر اُٹھائے کھڑی پہاڑی کی طرح ہیں، جس پر کئی لوگ چڑھے ہیں اور بے شُمار پگڈنڈیاں بناتے ہوئے گُزرے ہیں۔ اگر آپ پہلے سے بنی اُن پگڈنڈیوں پر نہیں چل رہے ہیں، تو کہانی کا کوئی نیا رُخ دیکھ رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے آپ کسی چوٹی تک پہنچ جائیں۔

کہانیاں گھڑی نہیں جاتیں۔ وہ گھٹتی رہتی ہیں۔ واقع ہوتی ہیں، آپ کے چاروں طرف۔ کچھ صاف نظر آجاتی ہیں۔ کچھ آنکھ سے اَوجھل ہوتی ہیں۔ اُوپر کی سطح کو ذرا سا چھیل دو تو بلبلا کر اُوپر آجاتی ہیں۔

سب کچھ اپنا تجربہ تو نہیں ہوتا، لیکن کسی اور کے مشاہدے اور وجود سے بھی گُزرو تو وہ تجربہ اپنا ہو جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

بوسیدہ دیوار سے جیسے اُستر اور چونا گرتا رہتا ہے۔ اخباروں سے ہر روز بوسیدہ خبروں کا پلاستر گرتا ہے۔ جسے ہم ہر روز پڑھتے ہیں اور لپیٹ کر ردّی میں رکھ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن خبروں کے کردار، سڑے پھل کے کیڑوں کی طرح اُن اخباروں سے باہر آنے لگتے ہیں۔ کونے کھدرے ڈھونڈتے ہیں۔ کہیں کوئی نمی مل جائے تو پنپنے لگتے ہیں۔ اِس مجموعے میں کچھ کہانیاں اُن کی بھی ہیں۔

مَیں نے بے وجہ ایک کوشش کی ہے اِن کہانیوں کو کچھ حصّوں میں ترتیب دینے کی۔ وہ نہ بھی کرتا تو آپ خود اپنے اپنے تجربوں کے حساب سے اُنہیں ترتیب دے لیتے۔

اِن میں کوئی بھی ایک کہانی ایسی نہیں تھی کہ مَیں اُسے مجموعے کا مرکز بنا کر، مجموعے کا نام دے دیتا۔ ڈیوڑھی میں بیٹھا جیسے ''پنجارہ'' رُوئی دُھنتا ہے۔ مَیں کہانیاں دُھنتا رہا۔ جس کا جی چاہے اپنے تکیئے، تلائیاں بھر لے۔

کچھ دُھنی ہوئی کہانیاں 'سلیم عارف' کے ڈراموں میں نظر آتی ہیں۔

گُلزار

Scanned by CamScanner

کتابوں سے کبھی گزرو تو یوں کردار ملتے ہیں
گئے وقتوں کی ڈیوڑھی میں کھڑے کچھ یار ملتے ہیں

Scanned by CamScanner

ساحر اور جادو

یہ ساحر کی میت اٹھنے سے پہلے کی بات ہے۔

میں بات جادو کی سنا رہا ہوں اور ذکر ساحر لدھیانوی کا ہے۔

جادو اور ساحر کا رشتہ بڑا عجیب تھا۔ جادو' جاوید اختر کا نک نام ہے۔ لاڈ کا نام۔ مزاج شاعرانہ بھی ہے' باغیانہ بھی ---- پوری PEDIGREE ہی ایسی ہے۔ باپ جاں نثار اختر، ماموں مجاز، اور اب سسر کیفی اعظمی!

باپ کی عزت تو کبھی کی نہیں اس نے۔ کوئی غصہ تھا۔ ناراضی تھی جو جادو کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ اپنے باپ کے خلاف۔ ماں کے جیتے جی تو برداشت بھی کر لیا کرتا تھا۔ لیکن ان کے گذر جانے کے بعد' بات بات پر گھر سے نکل جایا کرتا تھا اور سیدھا ساحر کے ہاں جا پہنچتا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ساحر بھی سمجھ جاتے تھے کہ پھر باپ سے جھگڑا کر کے آیا ہے۔ لیکن وہ بالکل ذکر نہ کرتے اس بات کا۔ جانتے تھے' پہلے تو جادو بھڑک اٹھے گا اور

Scanned by CamScanner

پھر رو پڑے گا۔ دونوں حالتوں میں اس کو سنبھالنا مشکل کام تھا۔

تھوڑا سا وقفہ دے کر کہتے۔ ''جادو، چل آ' ناشتہ کر لے۔''

اور ناشتہ کرتے کرتے جادو خود ہی بول بال کے بھڑاس نکال لیتا اور بسورتا ہوا وہ دن انہیں کے ہاں کاٹ دیتا۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ ساحر اُسے آگاہ کر دیتے۔

''اختر آ رہا ہے۔ دوپہر کے کھانے پر۔''

جادو نظر اٹھا کے دیکھتا کہ یہاں بھی چین نہیں۔ اس کا بس چلتا تو ساحر کے سامنے ہی کہہ دیتا۔ ''یہ باپ' ہر جگہ! ہر وقت کیوں-----؟''

جادو' بیٹا جاں نثار اختر کا تھا' اور مزاج پایا تھا اپنے ماموں مجاز کا۔ بہت جذباتی اور بہت غصیلا--- ساحر نے اسے بیٹے کی طرح پالا اور دوست کی طرح سنبھالا۔ ساحر کہتے۔

''جادو' ایروز میں بہت اچھی پکچر لگی ہے یار۔ وہ کیا نام ہے اس کا--- جا کر دیکھ کے آ---''

اور اس طرح وہ باپ بیٹے کا سامنا ہونے سے بچا دیتے۔ بڑا انوکھا رشتہ تھا ساحر اور جاوید کا۔

ایک بار وہ ساحر کے گھر سے بھی نکل گیا۔ ''آپ ہی نے زیادہ سر چڑھا رکھا ہے میرے باپ کو۔''

ساحر ہنس پڑے تو جاوید نے کہا۔ ''میرا باپ بھی اسی طرح ہنستا ہے مجھ پر۔ مجھے نہیں چاہئے کوئی بھی۔ نہ وہ' نہ آپ۔'' اور لڑکے گھر سے نکل گیا۔

کچھ دن غائب رہا۔ خودداری بہت تھی۔ ناک بہت اونچی تھی اور مزاج اس سے بھی اونچا۔ پتہ نہیں کہاں سویا اور کہاں کھایا-----!

کمال صاحب (کمال امروہی) کے پروڈکشن منیجر سے دوستی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شام گذار دیتا اور رات کو وہیں سٹوڈیو میں' پروڈکشن سٹور میں جا کر سو جاتا۔ اس

Scanned by CamScanner

سٹور میں جہاں ہر طرح کا پروڈکشن کا سامان بھرا ہوا تھا۔ مینا کماری کے دو فلم فیر ایوارڈ کی ٹروفیاں بھی پڑی تھی وہاں۔ وہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ٹرافی پیش کرتا' پھر یہ ٹرافی ریسیو کرتا' پھر حاضرین کی طرف سے تالیاں بھی بجاتا' اور پھر جھک کر لوگوں کا شکریہ بھی ادا کرتا۔ یہ واقعہ جاوید نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ تقریباً ہر روز سونے سے پہلے یہی ریہرسل کرتا تھا۔ کئی دن گزارے اس نے سٹوڈیو میں۔

پھر جب ساحر کے گھر پر نظر آیا تو مُنہ اُترا ہوا تھا۔ صورت سوکھی ہوئی تھی۔ ساحر نے لاڈ سے بلایا لیکن جادو کا غصہ ابھی اترا نہیں تھا۔ ''صرف نہانے کے لئے آپ کا غسلخانہ اور صابن استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو گراں نہ گذرے تو-----''

''ضرور-----'' ساحر نے اجازت دی پھر کہا'' کچھ کھالو!''

''کھالوں گا کہیں بھی۔ آپ کے ہاں نہیں کھانا ہے مجھے-----''

جب نہا کر آیا تو ساحر ڈریسنگ ٹیبل پر' ایک سو روپے کا نوٹ رکھ کر' مسلسل اپنے بالوں میں کنگھی کئے جا رہے تھے۔ اور الفاظ تلاش کر رہے تھے کہ جاوید سے کیسے کہا جائے کہ سو روپے رکھ لو----- جاوید کی خودداری سے ڈرتے بھی تھے' عزت بھی کرتے تھے۔ آخر ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔ ''جادو! یہ سو روپے رکھ لو میں تم سے لے لوں گا!''

سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ سو کا نوٹ تڑوانے کے لئے بھی لوگ بینک میں جاتے تھے' یا پٹرول پمپ پر۔

جادو نے یوں لیا نوٹ جیسے ساحر پر احسان کر رہا ہو۔ ''رکھ لیتا ہوں۔ لوٹا دوں گا' جس روز تنخواہ ملے گی۔''

جاوید' شنکر مکر جی کے ساتھ اسٹنٹ لگ گیا تھا جہاں اس کی ملاقات سلیم خان سے ہوئی تھی۔ بہت کمایا اس کے بعد اس نے۔ شراب ماموں کی طرح پیتا تھا اور پی کے بھڑاس

Scanned by CamScanner

باپ پر نکالا کرتا تھا' ساحر سٹائیل میں۔ لیکن وہ سو روپے اس نے کبھی واپس نہیں کئے۔ ہزاروں کمائے' لاکھوں بھی آئے' پر ہمیشہ یہی کہا ساحر سے۔ ''آپ کا سو روپیہ تو میں کھا گیا۔''

ساحر بھی ہمیشہ کہتے: ''وہ تو میں تم سے نکلوالوں گا بیٹا-----''

یہ نوک جھونک ساحر اور جادو میں آخری تک چلتی رہی۔ اور دوستی بدستور قائم رہی۔ ساحر کے بہت زیادہ دوست تو نہیں تھے لیکن وہ دوست پرور انسان تھے اور شام کی شراب پینے کے بعد لوگوں کی ایسی تیسی کر دیا کرتے تھے۔ جن دنوں کرشن چندر والے مکان میں رہتے تھے' ان کے پرانے دوست اوم پرکاش اشک برسوں ان کے ساتھ رہے۔ ایک بار میرے سامنے ہی اشک صاحب نے کہا تھا پنجابی میں۔ ''ساحر، شراب پینے کے بعد تو گالی گوچ پہ کیوں اتر آتا ہے؟''

ساحر نے پنجابی میں ہی جواب دیا تھا۔ ''شراب کے ساتھ کچھ چٹپٹا بھی تو چاہئے نا یار۔''

ساحر کے دوستوں میں ایک ڈاکٹر کپور بھی تھے' جو خود دل کے مریض تھے مگر ساحر کے معالج۔ ساحر کہا کرتے تھے۔ ''کپور' میں دیکھنے آؤں تجھے' یا خود کو دکھانے آؤں؟''

اس شام -----اس آخری شام بھی یہی ہوا!

اتنے برسوں میں' ساحر اپنا مکان بنوا چکے تھے----- ''پرچھائیاں'' ڈاکٹر کپور' ورسوا کے ایک بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ جادو ایک بہت کامیاب رائیٹر ہو چکا تھا۔ اس شام ساحر ڈاکٹر کپور کو دیکھنے گئے تھے۔ خبر ملی تھی کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہارٹ سپیشلسٹ ڈاکٹر سیٹھ انہیں دیکھنے آ رہے تھے۔ شاید راما نند ساگر بھی تھے وہاں۔ یا بعد میں آئے۔ ساحر نے کپور صاحب کا جی بہلانے کے لئے تاش منگوائی اور انہی کے بستر پر بیٹھ

Scanned by CamScanner

کے کھیلنے لگے۔ پتے بانٹتے بانٹتے اچانک ڈاکٹر کپور نے دیکھا' ساحر کا چہرہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ شاید وہ درد دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کپور نے پکارا: ''-----ساحر-----!''

اور اس کے ساتھ ہی ساحر' اس بستر پر لڑھک گئے۔ ڈاکٹر سیٹھ داخل ہوئے۔ بہت کوشش کی دل کو بحال کرنے کی۔ لیکن ساحر جا چکے تھے۔ ڈاکٹر کپور کی گھبراہٹ دیکھ کر رامانند ساگر' انہیں فوراً وہاں سے ہٹا کے اپنے گھر لے گئے۔

ساحر کا ڈرائیور' انور دوڑا آیا۔ اس نے لاش کو سنبھال لیا۔ لیش چوپڑا اُن کے بہت نزدیک تھے۔ ان کے ہاں خبر کی تو وہ سری نگر گئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جاوید کو خبر کی۔ ڈرائیور نہیں تھا تو وہ ٹیکسی لے کر پہنچے۔ اور اس ٹیکسی میں جاوید' ساحر کو ان کے گھر لے آئے' پرچھائیاں میں۔ انور اور ٹیکسی والے کی مدد سے انہیں اوپر لے گئے۔ فرسٹ فلور پر' جہاں وہ رہتے تھے۔

جاوید جیسے کسی سناٹے میں تھا۔ لیکن گھر پہنچ کر وہ جس طرح رویا ہے ان کے گلے لگ کر' زندگی میں کبھی نہیں رویا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہوگا۔ کہاں جائے' کس کو بلائے'، کچھ نہیں کیا جاوید نے۔ اکیلا بیٹھا رہا ان کے پاس' پاس پڑوس کے لوگ پہنچ گئے تھے۔ ایک پڑوسی نے کہا۔ ''تھوڑی دیر میں لاش اکڑنے لگے گی۔ دونوں ہاتھ سینے پر لے کر باندھ دو۔ بعد میں مشکل ہوگی۔

جاوید روتا رہا اور وہ سب کچھ کرتا رہا جو لوگ بتاتے گئے۔

پھر صبح ہوتے ہوتے لوگوں کو فون کرنے شروع کئے۔ جیسے جیسے خبر پھیلتی گئی' لوگ آنا شروع ہوئے۔ بیٹھنے کے لئے چادریں نکالو۔ ادھر کی کرسیاں ہٹا دو۔ ادھر کا دروازہ کھول دو۔ بچوں کی طرح' جاوید کے آنسو بہے جا رہے تھے اور وہ یہ سب کام کر رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

میت کے انتظام کے لئے نیچے آیا تو دیکھا ٹیکسی والا وہیں کھڑا ہے۔ ''اُف! بتایا کیوں نہیں؟ کتنے پیسے ہوئے تمہارے؟''

وہ کوئی بڑا مہذب انسان تھا۔ فوراً ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں صاحب --- نہیں پیسوں کے لئے نہیں رُکا۔ اس کے بعد میں کہاں جاتا رات میں ----؟''

جادو نے جیب سے بٹوہ نکالا۔

ٹیکسی والا پھر بولا۔ ''نہیں صاحب --- رہنے دیجئے صاحب ---''

جادو تقریباً چلّا کر بولا۔ ''یہ لو --- رکھو سو روپے۔ مر کے بھی نکلوا لئے روپے اپنے!''

اور پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔

یہ ساحر کا جنازہ اٹھنے سے پہلے کی بات ہے!!

Scanned by CamScanner

کُلدیپ نیّر اور پیر صاحب

جُمعے کا دِن تھا۔ 1998ء 14، اگست کی شام، اور میں کُلدیپ نیّر صاحب کے ساتھ، واگھا بارڈر کی طرف سفر کر رہا تھا۔ کار میں!

نیّر صاحب کئی سالوں سے یہ کرتے آ رہے ہیں۔ 14، اگست کی شام واگھا پر پہنچ جاتے ہیں۔ کُچھ اُدیبوں، فنکاروں، دانشوروں کے ساتھ، اور جب بارڈر پر تعینات فوجی سپاہیوں کی ڈیوٹی بدلتی ہے، اور دونوں مُلکوں کے جھنڈے اُتارے جاتے ہیں، تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ 'ہند۔ پاک۔ دوستی' کے نعرے لگاتے ہیں، اور رات کو بارہ بجے جب تاریخ بدلتی ہے تو شمعیں جلا کر آزادی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

بڑی سیدھی، لمبی سڑک تھی۔ اور شام کا جھٹپٹا بڑھ رہا تھا۔ اور نیّر صاحب کہہ رہے تھے۔

"یہ سڑک اگر اِسی طرح سیدھی چلتی رہے، اور کوئی گیٹ، کوئی رُکاوٹ نہ آئے۔

نہ کوئی ویزا پوچھے، نہ پاسپورٹ دیکھے، اور میں پاکستان گھوم کے آجاؤں، تو کیا لوٹ لوں گا اُس مُلک کا؟ لُوٹنے والوں کی تو نہ اس مُلک میں کمی ہے، نہ اُس مُلک میں۔ اُنہیں باہر سے کی کیا ضرورت ہے؟'' ____ پھر ایک وقفے کے بعد بولے: ''آخر وہ بھی تو وطن ہے میرا؟ میرا کتنا بڑا حصّہ اُس مُلک میں پڑا ہے۔''

میری آنکھوں میں کوئی سوال ہوگا۔ بولے:

''میرا اسکول ہے بھئی، مدرسہ میرا! میرے ماسٹر دِینا ناتھ اور مولوی محمد اسمٰعیل۔ میرا الف، بے کا قاعدہ، بستا، سب وہیں تو رکھا ہے۔ جڑیں وہاں رکھی ہیں، اور شاخیں کاٹ کے اِدھر لے آئے ____''

تیر صاحب کی آواز میں رکت آ گئی تھی۔ اُس روز کئی بار تیر صاحب نے سیالکوٹ کا ذکر کیا۔ جہاں گھر تھا اُن کا۔

''چاچے، تائے، پھُپھڑ، سب کے گھر پاس پاس ہی تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ لیکن کھُلا تھا۔ کہیں کوئی دیوار کھچی ہوئی نہیں تھی۔ آگے جا کے دُوسرے گھر شروع ہو جاتے تھے۔ زمین اِتنی تھی کہ چھینا جھپٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس احاطے کے ایک طرف، بہت گھنا پیپل کا پیڑ تھا، جو ہمارے گھر کے زیادہ قریب تھا۔ اُس کے نیچے ایک قبر تھی۔ پتہ نہیں کِس کی تھی۔ لیکن ماں نے کہہ کہہ کے اُسے 'پیر صاحب' کی قبر بنا دِیا۔

ماں پیپل پر پُوجا کا سیندُور لگاتی اور ساتھ ہی اُس قبر پر ایک دِیا رکھ دیتی تھی۔ سیندُور پیپل پر لگا کے، اُنگلی قبر کی اینٹ سے پونچھ لیتیں۔ آرتی کرتیں، چراغ کی آنچ پیپل

Scanned by CamScanner

کودے کر، دِیا قبر کے ٹوٹے ہوئے آلے پر رکھ دیتیں۔ بھوگ پیپل کو لگتا تو پیر صاحب کو بھی لگتا۔ گھر پہ کسی بات سے رنجش ہو جائے تو ماں پیپل سے پیٹھ لگا کے بیٹھ جاتیں، اور پیر جی سے باتیں کرتیں۔ کبھی رو بھی لیتیں۔ پھر جی ہلکا ہو جاتا اور وہ اُٹھ کے گھر آ جاتیں۔ پیر صاحب کو ساتھ لے آتیں۔ پیر صاحب کی مُکتی نہ ہونے دی اُنہوں نے!

اِمتحانوں میں یاد ہے، کہتی تھیں، پیر صاحب کو متھا ٹیک کے جانا۔ امتحان ہوں، تیوہار ہو، خوشی ہو، غم ہو، کوئی بیاہ، کوئی ابھرز ۔۔۔ ہر بات میں پیر صاحب ضرور شامل ہوتے تھے۔"

نیّر صاحب کبھی کبھی بڑے ٹھیٹھ لفظ پنجابی کے استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے: "کُچھ پُوچھنا ہو تب بھی، پیر صاحب سے پُوچھا جاتا تھا۔ ہمیں تو کوئی جواب نہیں مِلا۔ لیکن ماں کو ضرور اِشارے مِل جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ کہتیں تھیں، اُنہیں خواب میں آ کر بتا گئے تھے۔"

ہم واگھا پر پہنچ گئے ــــــ

دِن غروب ہو رہا تھا۔ بڑی لمبی چوڑی رسومات کے ساتھ، دونوں ملکوں کے جھنڈے اُتار لئے گئے۔ تھوڑے سے لوگ اُس طرف تھے، تھوڑے سے ہماری طرف بھی۔ فلمسٹار راج ببّر ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اُس طرف "اَسمہ جہانگر" آنے والی تھیں۔ نہیں آ سکیں۔ حکومت نے اُن پر پابندی لگا دی تھی۔

رات کو بارہ بجے، ہم سب نے موم بتّیاں جلائیں۔ کُچھ تصویریں لیں۔ 'ہند پاک دوستی' کے نعرے لگائے۔ کچھ سُوکھے، کچھ رُندھے گلے لے کر واپس آ گئے۔

اگلے دن ہم دِلّی لوٹ رہے تھے۔ میں واپس سیالکوٹ جانا چاہتا تھا۔ اِس لئے

Scanned by CamScanner

میں نے پھر بات شروع کر دی۔

''نیر صاحب! ماں نے خواب میں دیکھا تھا، تو آپ نے کبھی پوچھا، ماں سے کہ پیر صاحب کیسے لگتے تھے۔ اُن کی شکل وصورت کیا تھی؟'' نیر صاحب کا مُوڈ اب الگ تھا۔ وہ مُسکرائے۔ بولے!

''میں نے اپنا کیریئر investigative جرنلزم سے شروع کیا تھا۔ میرا یہ تفصیل پوچھنا لازمی تھا۔ اور جیسا ماں نے بتایا تھا، میں نے ویسا ہی پایا اُنہیں۔''

''پایا اُنہیں؟ مطلب؟ ____ آپ ملے؟ ____ یعنی ____'' میں اپنا سوال ٹھیک سے بنا نہیں پایا۔ وہ مُسکرائے تھے۔ کہنے لگے:

''1975ء کی بات ہے، جب مسز اندرا گاندھی نے ہندوستان میں ایمرجینسی ڈیکلیئر کر دی تھی۔ پولیٹیکل (ساسی) لیڈروں کے علاوہ جن intellectuals ، (ادیبوں، دانشوروں) کو حراست میں لے لیا گیا تھا، اُن میں، میں بھی شامل تھا____

وہ بھی جُمعے کا دن تھا۔ 24، جولائی 1975ء۔ مُجھے 'تہار جیل' میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ نظر بندی بالکل عارضی ہے۔ چند دنوں میں آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں نے پوچھا یہ حُکم کس نے دیا ہے، تو بغیر نام لئے مجھے جیلر نے اِتنا ہی کہا: میڈم نے! ____ چند دن گذر گئے۔ لیکن جب رہائی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو میں نے جیلر سے کہہ کے اپنی کُچھ کاپیاں کتابیں منگوالیں۔ اُس شریف آدمی نے ایک ٹیبل اور ٹیبل لیمپ کا بھی انتظام کر دیا۔

آہستہ آہستہ، جب میعاد بڑھنے لگی اور غیر یقینی محسوس ہونے لگی م تو ایک روز من ہی من، میں نے اُن سے پوچھا: ____ 'میری رہائی کب ہوگی؟' ____''

Scanned by CamScanner

میں چُپ رہا، تو نیّر صاحب بھی چُپ چاپ میری طرف دیکھنے لگے۔ ہم امرتسر کے ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اچانک بات میرے اندر جذب (sink) ہوئی، اور میں نے پوچھا ___

''اُن سے؟ ___ کِن سے؟ ___ کِس سے پوچھا آپ نے؟''

وہ شاید اِسی سوال کا انتظار کر رہے تھے۔ بولے:

''پیر صاحب سے!''

''اوہ ___!''

''اور وہ میرے خواب میں آئے۔ سفید لمبی داڑھی۔ اور اُس کے پیچھے سبز رنگ کا لباس تھا۔ وہی ماں نے بتایا تھا۔ سر پہ مجھے یاد نہیں، کچھ پہنا تھا، یا نہیں ___''

''تو کیا کہا ___؟''

''کہا کہ آتے جمعرات تک تُم رہا ہو جاؤ گے۔''

''اور کچھ بھی کہا؟''

''ہاں ___ کہا بہت ٹھنڈ لگتی ہے بیٹا۔ اپنی چادر دے دے۔''

یہ کہہ کے نیّر صاحب ہنس دیئے۔

''تو آپ کی رہائی ___ مطلب ___ ہوئی جمعرات کے دن؟''

''نہیں ___ جمعرات کے دن، میں بہت بے چین رہا۔ پتہ نہیں کیوں میں چاہتا تھا کہ وہ سچ ہو جائے۔ مجھے جیل سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن پیر صاحب کے قول کے لئے پریشان رہا۔ معمول کی طرح، رات دیر تک کام کرتا رہا۔ صبح دیر سے اُٹھا۔

وہ دن بھی جمعے کا تھا۔ 11، ستمبر 1975ء اور جیلر نے آکر خبر دی کہ آپ کی رہائی

Scanned by CamScanner

کے آرڈر آ گئے ہیں۔ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا: 'کب آئے؟' ___ تو اُس نے بتایا کہ 'کاغذات تو کل رات ہی آ گئے تھے۔ لیکن میں جب ڈیوٹی پر آیا تو دیر ہو گئی تھی۔ آپ ٹیبل پر کام کر رہے تھے۔ اور آپ کا حکم تھا کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔'

میں نے بآواز بلند دوہرایا ___ 'کل ___ یعنی جمعرات کے دن کاغذات آ گئے تھے؟''

ذرا ٹھٹک کر جیلر نے کہا: 'جی! ___ آپ کو پہلے سے خبر تھی کیا؟' ___ اور میں نے بہت خوش ہو کر بتایا اُسے! 'ہاں ___ مجھے خبر مل چکی تھی!''

اِس کے بعد کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ تیر صاحب نے بتایا کہ ماں نے کہا تھا!

''بیٹا، سیالکوٹ جا کر، اُن کی قبر پر، چادر ضرور چڑھا دینا۔ اُنہیں سچ مچ ٹھنڈ لگتی ہو گی! اور ماں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں فوراً نہیں جا سکا۔ اُن دنوں، سیالکوٹ کا ویزا نہیں ملتا تھا۔ 1980ء میں ماں گذر گئیں تو پیر صاحب کی چادر پہنچانا اور بھی ضروری ہو گیا۔ اور جب میں ___ سیالکوٹ گیا تو اُس علاقے کی شکل بدل چکی تھی۔ ہمارے مکانوں میں کچھ اور لوگ آ کر بس گئے تھے۔ سامنے کے احاطے میں چھوٹی چھوٹی دُکانیں بن گئیں تھیں۔ ایک پوری مارکیٹ کی شکل بن چکی تھی۔ اور وہ قبر مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ اندازے ہی سے میں نے وہ جگہ تلاش کی، جہاں کبھی پیپل کا پیڑ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب نہ وہ پیڑ تھا۔ نہ وہ قبر ___!

اُسی جگہ پر، ایک دُکاندار سے میں کئی روز ملتا رہا۔ وہ یہی کہتا تھا، اُس نے وہاں کوئی قبر نہیں دیکھی۔ میں لوٹنے ہی والا تھا، جب ایک روز وہی دُکاندار، مجھے مارکیٹ کے

Scanned by CamScanner

باہر نکل گیا۔ اُس نے پوچھا:

''کس کی قبر تھی وہ؟ جس کی تلاش کر رہے تھے آپ؟'' میں نے بتایا، ایک پیر صاحب کی تھی ہماری ماں کو بہت عقیدت تھی اُن سے۔ تھوڑی پشیمانی کے ساتھ اُس نے اِقرار کیا، اور کہا: ''جی تھی تو سہی، ہماری دُکان سے لگی ہوئی تھی۔ ہم رفیوجی (مہاجر) تھے۔ دُکان ہی میں رہنے کی جگہ تھی تب۔ جگہ بہت تنگ تھی۔ اِس لئے ہم نے ہٹا دی اور جینے بھر کے لئے، ایک قبر کی جگہ اور کھینچ لی۔''

میں واپس آ گیا۔ اور ایک روز نظام الدین اَولیا کی درگاہ پہ جا کر وہ چادر چڑھا دی، جو اپنے ساتھ سیالکوٹ لے کر گیا تھا۔''

''وہ پھر کبھی نہیں آئے خواب میں؟'' میں نے پوچھا!

''نہیں! کئی بار مشکل کی گھڑی میں جی چاہا وہ پھر خواب میں آئیں۔ میں کچھ پوچھوں۔ وہ کچھ بتائیں۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ لگتا ہے پیر صاحب ماں کے ساتھ ہی چلے گئے۔ مُکتی پا گئے۔''

Scanned by CamScanner

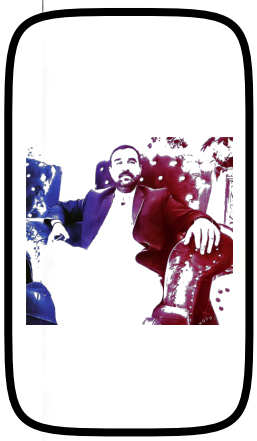

بھوشن بنمالی

دُوسری بار جب چائے ٹھنڈی ہوگئی تو سنتوش جی نے نوکر سے پوچھا:

''کیا ہوا؟..... اُٹھا نہیں بھوشن؟''

''جی ابھی تو نہیں اُٹھے۔ میں آواز دے کر آ گیا تھا!''

''وہ تو سر پہ ڈھول بجانے سے بھی نہیں اُٹھتا۔ آواز دینے سے کیا اُٹھے گا؟... چلو۔ تُم دوبارا چائے بناؤ، اور لان میں لگا دو۔ میں اُٹھاؤں گی۔''

بھوشن اپنی پتنی اُوشا اور اپنی ساس، سنتوش بنسل سے ایک ہی طرح محبت کرتا تھا۔ اُتنی ہی شدت کے ساتھ! اُوشا سے روٹھتا تو سنتوش جی کے پاس چلا جاتا۔ اُن سے جھگڑا ہوتا تو اُوشا کے پاس واپس آ جاتا۔ اِس بار اُوشا رُوٹھ کر مدراس چلی گئی تو وہ پنجاب اپنی ساس کے ہاں چلا گیا۔

Scanned by CamScanner

گھر گھاٹ سب کچھ تھا۔ لیکن عادتاً خانہ بدوش تھا یہ شخص! نہ گھر پہ خوش تھا، نہ گھاٹ پہ! اِسی طرح ایک روز جھولا اُٹھا کر دِلّی سے میرے پاس چلا آیا تھا۔ جھولے میں کچھ کتابیں تھیں۔ کچھ ڈائریاں اور کچھ نہیں! شاید کچھ خط اور تصویریں جن پر سنتوش سے جھگڑا ہو گیا تھا..... سنتوش اور وہ مل کر ایک ہندی کا ادبی رسالہ نکالتے تھے۔ نئی صدی۔ اُس وقت تک اُوشا سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُوشا اُن دنوں پینٹنگ سیکھ رہی تھی۔

بمبئی کیوں آیا تھا، صاف صاف اُس نے کبھی نہیں بتایا۔

''کہاں رہو گے؟'' میں نے پوچھا تھا۔ اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''یہیں! جب نکال دو گے۔ تب سوچوں گا، کہاں جانا ہے؟''

میں لاجواب ہو گیا۔ پوچھا:

''واپس دِلّی نہیں جاؤ گے؟''

ایک وقفہ لیا۔ مُسکرایا اور کہا:

''کرشن نے ایک بار متھرا چھوڑا تو پھر وہاں لوٹ کر نہیں گئے۔''

جواب عجیب تو تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ متھرا میں کیسے چھوڑ کر آیا ہے۔ میں تو صرف یہی جانتا تھا، کہ وہ مسز سنتوش بنسل کے ساتھ ایک ماہواری رسالہ نکالا کرتا تھا۔ میری کچھ نظمیں چھپی تھیں اُس میں۔ اور جب دِلّی گیا تو ایک دوپہر اُن کے دفتر میں بیٹھ کر بیئر پی تھی۔ ادیب دوستوں کا ایک بڑا حلقہ تھا اُن کا۔ کچھ لوگ آتے گئے اور بیئر کی بوتلیں کھلتی رہیں۔ وہیں فرش پر لڑھکتی رہیں۔ ایک چپراسی دوپہر بعد تک کچھ تلی ہوئی مچھی، کباب

Scanned by CamScanner

اور پکوڑے لالا کر دیتا رہا، اور سب شاعری کے چٹخارے لیتے رہے۔ بھوشن ہندی میں لکھتا تھا۔ بھوشن بنمالی کے نام سے۔ اور اُردو پڑھتا تھا۔ وہ پلاتا بھی رہا۔ سُناتا بھی رہا۔ سنتوش اُن کی بڑی مدّاح تھیں۔ لیکن اس دوران کسی کو پیسے نکالتے نہیں دیکھا۔ ضرور دُکانوں پر پرچی چلتی ہوگی۔ جیسی شاعروں کی چلا کرتی ہے۔

وہ پہلی ملاقات تھی میری۔ دُوسری اُس کے ایک سال بعد بمبئی آنے پر ہوئی، جب میں ایک شام گھر لوٹا۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ میں نے اندر جا کر نوکر سے پوچھا: ''بیئر کہاں سے آئی؟''

''صاحب نے پیسے دے کر منگوائی تھی!''

اُدھار میرے ہاں کُفر کی طرح منع ہے۔ اور بھوشن کے ہاں ایمان کی طرح رائج!

میں اپنی ہی کچھ غیر شاعرانہ عادتوں سے مجبور ہوں۔ میں جلدی سو جاتا ہوں۔ اور صبح بہت جلدی اُٹھ جاتا ہوں۔ بھوشن دیر تک سوتا رہتا۔ اور یہ بات مجھے پریشان کرنے لگی۔ کئی بار وہ کمرہ اندر سے بند کر لیتا۔ دروازہ پیٹ پیٹ کے مر جاتے، لیکن وہ نہ اُٹھتا۔ مجھے آخر کار تمام دروازوں کی چٹخنیاں نکلوا دینی پڑیں۔ وہ ایک بیڈ رُوم کا فلیٹ تھا۔ میرا گھر بھی تھا۔ دفتر بھی، میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

''نئی صدی کا کیا ہوا؟''

''گذر گئی!'' بڑا مختصر جواب تھا۔

''تو اب کیا کرو گے؟''

''جو آپ کہیں گے!''

Scanned by CamScanner

میں پھر لاجواب ہوگیا۔ بس میرے ساتھ ہی لگ گئے۔ نہ اسٹینٹ، نہ معاون، بس جوڑی دار ہوگئے۔ کتابوں کو لے کر چرچے ہوتے۔ جے کرشنا مورتی پر تبصرے ہوتے۔ ہسٹری پڑھی جاتی، دوہرائی جاتی۔ ایسے ہی ایک مُوڈ میں ایک بار پوپ کو خط لکھ کر بھیج دیا کہ اب تو سائینس ثابت کر چکی ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے نہ کہ سورج زمین کے گرد، اب تو گیلیلیو کو قانونا معافی ملنی چاہیئے۔ یا چرچ کو اُس سے معافی مانگ لینی چاہیئے۔ خط تو پوپ تک جانے پہنچا کہ نہیں، لیکن کوئی دس پندرہ سال کے بعد جب ایسا ہوا تو ہم دونوں فون پر بات کر کے بہت خوش ہوئے۔ بیچ میں کئی سال کا وقفہ تھا، تب وہ الگ رہنے لگے تھے۔ پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ پھر ایک روز وہ دِلّی سے اُوشا کو بیاہ کر لے آئے۔ سنتوش پھر بھی اُن کے ہاں آتی جاتی رہیں۔ اور اُوشا کی ناراضگی بنی رہی۔ عجیب ہی سا رشتہ تھا۔ دونوں کو یہی لگتا تھا کہ دُوسرے نے اُن کے رشتے پہ چھاپہ مارا ہے۔ اور بھوشن اپنی پڑھائی لکھائی میں مست رہتے۔ کبھی ملتے تو وہ دن بہت یاد کرتے تھے جب میرے ساتھ دشت نوردی پہ نکلا کرتے تھے۔

''بھائی، وہ رات جوشی مٹھ کی.....؟''

پہاڑوں میں آوارہ گردی کرتے کرتے ہم ''رُودر پریاگ'' پہنچے تھے۔ بھوشن تو تھے ہی، ترن تارن بھی ساتھ تھے، اِس بار بھی ڈرائیور کوئی نہیں تھا۔ گاڑی میں خود چلا رہا تھا۔ کار ایک جگہ روک کر، ہم بازار میں ٹہلنے نکل گئے۔ تازہ پھل نظر آئیں، تو پھل خرید لیں۔ سبزی نظر آئے تو سبزی خرید لیں۔ ترن نے پوچھا بھی!

''بھائی، کیا کریں گے یہ سب؟ اور پھل بھی اتنے کون کھائے گا؟''

Scanned by CamScanner

''کھانا کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے؟ خرید تو لیں! بمبئی میں کہاں ملتا ہے یہ؟''

بھوشن نے گرم گرم جلیبی توڑتے ہوئے کہا۔

''جس ڈاک بنگلے پر رُکیں گے، وہیں دے دیں گے!''

پہاڑوں میں رُکنے کا وہی ایک طریقہ ہے۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے ڈاک بنگلے جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ آج کل پتہ نہیں کیوں نہیں بناتے! شام ابھی دُور تھی۔ وقت بھی تھا۔ سوچا کچھ اور آگے نکل چلیں۔ آنند پریاگ چلتے ہیں۔ وہیں کے ڈاک بنگلے میں رُکیں گے۔ گاڑی تک آئے تو ایک سردار جی نے آگے بڑھ کے پوچھ لیا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں، سر؟''

سفر کرتی ہوئی گاڑیاں اُن کی حالت سے پہچانی جاتی ہیں۔ اور جس طرف رُخ ہو، لوگ سفر کی سمت بھی جان جاتے ہیں۔ ہم نے بتایا آنند پریاگ تک جانے کا اِرادہ ہے۔

''جگہ ہو تو لفٹ دیں گے؟''

''آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''وہیں اُتار دیجئے گا۔ میرا گھر ہے وہاں!''

''آیئے!''

ہمسفر کی تو ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ بڑے خوش دل اِنسان تھے۔ فوجی تھے۔ اپنے گھر آئے تھے۔ آنند پریاگ پر پُل کی مرمّت ہو رہی تھی، اِس لئے آگے ایک لمبا ڈالو رشن (Diversion) تھا۔ سَندھو صاحب نے درخواست کی کہ انہیں وہیں اُتار دیں۔ اور اچھے ہندوستانیوں کی طرح گھر چلنے کی دعوت بھی دی۔ بھولا سنگھ سِندھو اُن کا نام تھا۔ لیکن

Scanned by CamScanner

دونوں بار اُنہوں نے بی۔ایس سندھو ہی کہا۔ یہ بھی کہا کہ، ''آگے کہیں کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا، اس لئے گھر چلیں۔ کھانا کھا کر جائیں۔'' لیکن ہم نے رُخصت چاہی۔ سُورج پہاڑ کے پیچھے جا چُکا تھا۔

ڈاک بنگلے پر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چوکیدار کو جگایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ ہمارے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے وہ 'نہیں' کہہ دیتا تھا۔

''کمرہ خالی ہے؟''

''نہیں۔''

''ایک رات کے لئے....''

''نہیں!''

''صبح پانچ بجے.....''

''نہیں!!''

اچانک اُسے ڈانٹ کر پوچھا۔

''میجر بخشی آئے ہیں؟''

نہیں کہتے کہتے وہ رُک گیا۔ ''کون میجر صاحب؟''

''میجر صاحب نے آج کے لئے بُکنگ کی تھی۔ کیا ہوا؟''

اُس نے مُنہ اُٹھا کر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، میں نے حُکم دے دیا۔

'' چلو پانی گرم کرو۔ میجر صاحب آنے والے ہیں! رجسٹر کہاں ہے؟.....

Scanned by CamScanner

دِکھاؤ!!''

وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ بھوشن نے فروٹ اور سبزیوں والا تھیلا اُسے تھما دیا۔

''یہ رکھ لو۔ صبح گھر لے جانا۔''

سب کمرے خالی تھے۔ رہنے کا انتظام ہو گیا۔

ہم لوگ گلاس بنا رہے تھے کہ بھوشن نے مذاق کیا۔

''اب وہسکی کے ساتھ، بسکٹ ڈبو کے کھائیں گے! اور تو کچھ ہے نہیں!''

اُسی وقت ایک پہاڑی منڈوا آ پہنچا۔

ایک ٹفن کیریر لے کر۔ سندھو صاحب نے کھانا بھیجا تھا۔ اِس طرح کی مہمان نوازی صرف اِسی ملک میں ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں!

ہمیشہ کی طرح اگلی صبح پھر چلنے کی تیاری۔ اور ہمیشہ کی طرح ہی بھوشن کو پھر نیند میں بستر سے اُٹھا کر گاڑی میں ڈال دینا پڑا۔ وہی چار بجے اُٹھ کے چل دیئے۔ سفر میں پروگرام ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سُورج سے پہلے چلو۔ اُسے راستے میں ملو اور اُس کے جانے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ_____ یہ بات رات ہی کو طے ہو گئی تھی کہ اب یہاں سے واپس جانے کی کوئی تک نہیں ہے۔ تھوڑا سا سفر باقی ہے۔ جوشی مٹھ جاتے ہیں۔ وہاں سے بدری ناتھ، اور ہو سکے تو گوبند گھاٹ پار کر کے، ویلی آف فلاورز (Valley of Flowers) اور ہیمکُنڈ دیکھ کر لوٹیں۔ پھر جانے کب آنا ہو اِن پہاڑوں میں۔ اور ہو بھی کہ نہیں۔ بھوشن تو مان گئے۔ ترن تارن کو منانا پڑا۔

اگلا پڑاؤ جوشی مٹھ تھا!!

Scanned by CamScanner

آنند پریاگ سے نکلے ہوئے تین پہر ہو چکے تھے۔ ہم مسلسل دھوپ چھاؤں اوڑھے چل رہے تھے۔ ترن نے پوچھا:

''بھائی ڈرائیور کیوں ساتھ نہیں لیتے آپ؟.... ہمیشہ خود ہی ڈرائیو کرتے ہیں ___!''

''کیوں؟ کیا بُری چلاتا ہوں گاڑی؟''

''نہیں، آپ اِدھر اُدھر بہت دیکھتے ہیں ناں! اِن پہاڑوں پر تو.....''

بھوشن زور سے ہنس پڑے!

''جب تک پڑاؤ نہیں آتا، اِن کی ہوائیاں اُڑی رہتی ہیں۔ ویسے اُڑنے سے پہلے بھی اِن کا رنگ زرد تھا۔''

بھوشن غالبؔ بڑی کثرت سے کوٹ (quote) کرتے تھے۔ بڑا خطرناک موڑ تھا۔ اور اُوپر سے آتی ہوئی کسی بس کا ہارن سُنائی دے رہا تھا۔ ہر طرف ایسے سرسبز جنگل کہ سُورج کی روشنی بھی ہری لگتی تھی۔ جوشی مٹھ کا موڑ مُڑے تو مُنہ سے ''واہ'' نکل گئی۔ جوشی مٹھ میں برف پڑی تھی۔ وادی کے اِس طرف کچھ بھی نہیں، اور اُس طرف ہر چیز سفید تھی۔ لگتا تھا جیسے کیک پر، کریم سے ڈریسنگ کی گئی ہو۔

جوشی مٹھ کے بازار میں جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کر دی۔ گاڑی کا دروازہ کھولا، اور فوراً ہی ڈر کے بند کر دیا۔ باہر ایسی ٹھنڈی ہوا کہ جیسے لُوٹ لینے کو دوڑی۔ شال اور کس کے لپیٹ لی۔ مفلر اُوپر چڑھا لئے۔ باہر آ کر رہنے کے لئے جگہ دیکھنے گئے۔ وہ ضروری تھا۔

Scanned by CamScanner

بازار اُوپر تھا۔ شہر نیچے۔ سیڑھیاں اور ڈھلانیں، ڈھلانیں اور سیڑھیاں! پہاڑوں پر نیچے اُترنا اتنا ہی گھٹنے توڑ ہوتا ہے، جتنا اوپر چڑھنا۔ اِسی لئے کشمیری گھر سے نکلنے پر دُعا دیتے ہیں، 'اُرزوَ ڈُرکُٹھ'.... (تیرے گھٹنے سلامت رہیں۔) ایک جگہ بے شمار سیڑھیاں اُترنے کے بعد ایک آشرم ملا۔ بڑا آشرم!

ایک پنڈت جی نے رہنے کو جگہ دی۔ ایک کمرہ بھی کھول دیا۔ اور کوئی مسافر وہاں نظر نہیں آیا۔ ایک ہی کمرے میں تین چار پائیاں لگوا دیں۔ لیکن اوڑھنے بچھانے کو پتلی سی ایک دری، تلائی، اور معمولی سا ایک کمبل، پنڈت جی نے کہا:

''اب اس موسم میں کون آتا ہے مہاشے۔ جس موسم میں آتے ہیں اُس کے لئے کافی ہے۔ کچھ ساتھ بھی لے کر آتے ہیں، کچھ بازار سے لے لیتے ہیں۔ کرایے پر سب مل جاتا ہے۔''

پنڈت جی کے کہنے سے راہ مل گئی۔ کمرے کی چابی لی اور پھر وہی، پہاڑ بھر سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر آئے۔ اُوپر آئے تو گاڑی کے سامنے والے شیشے پر، وائپر کے نیچے ایک رُقعہ چپکا ہوا تھا۔ لکھا تھا!

''یہاں سے کچھ آگے جا کر، بازار کے آخر میں ایک پٹرول کا ڈپو ہے۔ وہاں سے ملٹری کیمپ کو راستہ جاتا ہے۔ آج رات کا کھانا، آپ ہمارے ساتھ، ہمارے میس میں کھائیں:

بی۔ ایس۔ سندھو!''

رقعہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟ بھوشن بولے:

Scanned by CamScanner

''جیسے ہم آئے۔ وہ بھی آ گیا ہوگا۔ اور ہماری گاڑی تو پہچانتا ہی تھا۔''

''لیکن اُسے اگر جوشی مٹھ آنا تھا تو کہہ دیتا۔''

''کیسے کہتا؟ آپ نے تو یہی بتایا تھا کہ آنند پریاگ تک جا رہے ہیں۔ آگے کا پروگرام تو رات کو طے ہوا۔''

بہر حال ہم نے موٹی موٹی کچھ تلائیاں اور رضایاں کرایے پر لیں۔ ایک انگیٹھی خریدی۔ تھوڑے سے کوئلے خریدے اور ٹھنڈ مارنے کے سارے انتظام کرنے کے بعد، رات کو بھولا سنگھ سندھو کے میس میں پہنچ گئے۔ جوانوں کو پہلے ہی خبر ہو چکی تھی۔ بڑی خاطر کی اُن لوگوں نے۔ ایک بڑی سی انگیٹھی جلا کر بیچ میں رکھ لی اور رَم پلاتے رہے۔ ایک تو پنجاب رجمنٹ، اُوپر سے پٹیالوی پیگ رم کے! خوب پی، لیکن اُس پر جم کے وہ پنجابی شاعری سُنی کہ بس ہوگئی۔ ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں۔ پنجابی شاعری کو، پنجابی لطیفوں سے ضرب دو تو کیا حال ہو؟ ہم سب کا وہی حال ہوا۔ آخر میں اُن کے اپنے ہاتھوں کے بنے گلاب جامن! بھوشن کو ایک تولیہ گلے میں، بب کی صورت باندھ دیا گیا۔ گلاب جامن کا آدھا رس مُنہ میں جاتا تھا، آدھا کپڑوں پر ____!

رات کو بہت دیر سے واپس لوٹے۔ وہاں راستوں پر سٹریٹ لیمپ تو تھے نہیں۔ اندھیرے میں وہ سیڑھیاں تلاش کرنا شروع کیں جو برلا آشرم کو اُترتی تھیں۔ راستے میں آدم نہ آدم زاد کہ راہ پوچھیں۔ گاڑی کی لائٹ سے کوئی اندازہ نہ ہوا۔ گاڑی پھر ایک جگہ لا کر پارک کر دی۔ ترن تو گاڑی میں بیٹھنے کو بھی تیار نہ تھا۔

Scanned by CamScanner

ایک شخص ٹارچ لے کر آتا ہوا نظر آیا تو اُسے تھام لیا۔ اُس نے سمجھایا بھی کہ تھوڑا آگے چل کر وہ سیڑھیاں ہیں، جو آشرم کی طرف جاتی ہیں۔ کچھ دُور وہ ہمارے ساتھ چلا بھی، لیکن ہمارا حال دیکھ کر، جلد ہی ٹارچ بجھا کے کھسک گیا۔ بھوشن کو ترن نے سنبھال رکھا تھا۔

ایک جگہ ایک سیڑھیاں نظر تو آئیں۔ لگا کہ وہی ہیں۔ سو ہم نے اُترنا شروع کر دیا۔ میں آگے آگے چل رہا تھا اور کئی بار ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیوں کا انداز کر رہا تھا۔ اور بتاتا جا رہا تھا۔ اچانک پتہ چلا کہ میرے پیچھے تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اور دُور سے ترن تارن کی آواز سُنائی دے رہی تھی ____

"سٹیپ، سٹیپ، سلووپ! سٹیپ، سٹیپ سلووپ!! (step, step, slope...)"

ہر دو سیڑھیوں کے بعد ایک وقفہ آتا تھا۔ ترن تارن سنبھال سنبھال کے بھوشن کو نیچے اُتار رہے تھے۔ کسی طرح آشرم پہنچے۔ کمرے کی چابی لگی تو یقین ہُوا کہ صحیح جگہ پر آئے ہیں۔

لپھ تلائیاں تیار کر گئے تھے۔ بھوشن کو ایک چارپائی پہ سُلا کے رضائی اوڑھا دی۔ جس شئے کو ہاتھ لگائیں، یہی لگتا تھا کہ فرج سے نکلی ہے۔ انگیٹھی سُلگانے کی کوشش کی۔ کوئلے جما کے نیچے سے کاغذ جلائے۔ تھوڑی سی روشنی ہوا اور کاغذ جل کے راکھ ہو جائے۔ کوئلے برف کے ٹکڑے لگتے تھے۔ اور اُوپر سے سیلے۔ جلیں تو کیسے؟ اخباریں، رسالے جو جمع ہوئے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ میں نے کہا:

Scanned by CamScanner

''یہی حال رہا ترن، تو کتابیں جلا کے رات کاٹنی پڑے گی۔''

اُسی پر ترن کو ایک ترکیب سُوجھی ___ بوتل میں برانڈی کافی تھی۔ وہ اُٹھا لایا۔ نیچے سے آگ جلا کر اُوپر سے کوئلے پر برانڈی انڈیلنی شروع کی۔

''بس ایک کوئلہ سُلگ گیا تو انگیٹھی جل جائے گی۔''

نیچے سے آگ جلتی، اور جب کوئلے پر پتلی سی برانڈی کی دھار پڑتی تو ایسی خوبصورت ایک نیلے رنگ کی آگ جلتی کہ کوئلا نیلم کا ہیرا لگتا۔ ہاتھ پہ اُٹھا لینے کو جی چاہتا۔

برانڈی تو تقریباً ختم ہوگئی۔ لیکن اس کوشش میں ایک کوئلہ لال ہو کر دہکنے لگا۔ ایسے ہی جیسے شراب زیادہ چڑھ جائے تو آنکھ لال ہو جاتی ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ اُوپر سے پھونکنے لگے۔ نیچے سے ہوا دینے لگے۔ اور انگیٹھی سُلگنے لگ گئی۔ کچھ دُھواں ضرور جمع ہونے لگا کمرے میں! آدھی رات گذر گئی انگیٹھی کو لال کرتے۔

بستر ٹھیک کئے۔ لیٹے تھے کہ ترن نے دھیرے سے آواز دی۔ میرے 'ہوں' کہنے پر بولا:

''میٹرک میں ایک سبق پڑھا تھا کہ بند کمرے میں کوئلے جلا کر نہیں سونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اُس سے ایک گیس پیدا ہوتی ہے جس سے آپ بے ہوش ہو سکتے ہیں اور مَر بھی سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی کھڑکی یا روشندان کھلا رہے جس سے آکسیجن اندر داخل ہوتی رہے!''

Scanned by CamScanner

چاروں طرف نظر دوڑائی ___ اُس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کوئی روشندان نہیں تھا۔ اُلجھن ہوگئی۔

''ترن یار، میٹرک کا پڑھا آج ہی یاد آنا تھا تجھے؟''

مجھے تسلّی دینے کے لئے اُس نے پوچھا۔

''ویسے کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا؟''

''اس سردی میں کیا کوئی بے ہوش ہوگا؟''

کہہ تو دیا لیکن ایک بے چینی سی رہ گئی۔ ترن نے پھر کہا۔

''ایسا کرتے ہیں، دروازہ تھوڑا سا کھول دیتے ہیں!''

''ٹھیک ہے!''

دروازہ کھولا تو ہوا ایسی بے رُخی سے داخل ہوئی جیسے ریڈ پہ آئی ہو۔ بہت تھوڑا سا کھول کے رکھا تو لُچّوں کی طرح سیٹی بجانے لگی۔ سمجھ نہ آیا کیا کریں؟..... ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ ایک سُوٹ کیس بیچ میں ڈال کر دروازہ باندھ دیں۔ باندھتے کہاں سے؟ رسّی تو تھی نہیں، پاجامے کا ناڑا کھولا۔ اُسے دروازے سے باندھ کر ایک سُوٹ کیس بیچ میں اٹکا دیا۔ کچھ اطمینان تو ہوگیا۔ لیکن کمرے میں سردی بڑھ گئی۔ نیند غائب ہوگئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک خیال آتا کہ ''بھوشن کا کیا حال ہے؟'' ایک رضائی اور کمبل تو تھا اُن پر، اُٹھ کر ایک رضائی اور ڈال دی۔

ترن نے پھر کروٹ لی اور کہا: ''ہوا دیوار سے ٹکرا کے سیدھی بھوشن کو تلاش کرتی ہے۔'' اور چُپ ہوگیا۔ ایک وقفے کے بعد میرے مکالمے کی باری تھی۔ ''ترن، جیسے جیسے

Scanned by CamScanner

رات بڑھ رہی ہے، ٹھنڈ بھی بڑھتی جا رہی ہے! ___ میں اپنی تلائی اُن پر ڈال دیتا ہوں۔ ایسا نہ ہو صبح جُلاہے کی جوائی کی طرح مُسکرا رہے ہوں!''

ترن چُپ رہا۔ میں نے اپنا بستر اُلٹا کر لیا۔ کمبل نیچے کر لئے۔ رضائی اُوپر لے لی۔ اور تلائی بھوشن پر ڈال دی۔ تھوڑی دیر میں انگیٹھی بھی ٹھنڈی ہونے لگی۔ ترن نے اُٹھ کر تھوڑے سے کوئلے اور ڈال دیئے۔ اور ساتھ ہی اپنی رضائی بھی بھوشن پر ڈال دی۔ اور پھر تلائی کے اندر گھس کے لیٹ گیا۔ اِسی اُدھیڑ بن میں تھک تھکا کر آنکھ لگ ہی گئی۔

ظاہر ہے، صبح دیر سے اُٹھے۔ بھوشن اُس روز ہم سے پہلے جاگ گئے تھے۔ چارپائی سے ہی کروٹ لے کر دیکھا اُنہیں۔ بڑے مطمعین لگ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''کیوں؟ ٹھیک سے نیند آئی رات کو؟''

ایک جمائی لے کر بولے: ''نیند تو اچھی آئی۔ لیکن ایک بات بتایئے۔ رات کو آپ لوگ اپنا سامان اُٹھا اُٹھا کر کیوں میرے اُوپر ڈال رہے تھے؟''

ترن پھٹ کے ہنس پڑا! ''لو ___ اور سُنو تُمہاری وجہ سے آدھی رات تک سوئے نہیں۔ اب اُٹھو اور اُٹھ کے چائے کا انتظام کرو!!''

خانساماں نے دُوسری چائے تیار کر لی تھی۔ ٹرے سجا کر لان میں لا رہا تھا جب سنتوش جی کو بھوشن کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ پوچھا:

''کیوں؟ آپ سے بھی نہیں اُٹھے؟''

سنتوش جی نے بُکل میں مُنہ دے رکھا تھا۔ آ کر کُرسی میں دھنس گئیں۔ اور زور

Scanned by CamScanner

سے گردن مار کے بولیں:

''نہیں_____ اب وہ نہیں اُٹھے گا!!''

اور اپنی سسکیاں بغل کے اندر ہی شال میں دبالیں!!

Scanned by CamScanner

ہے سر پانی میں اور پاؤں زمیں پر،
یہ نگری ممبئی کی ہے _ _ _!

Scanned by CamScanner

باس

پارٹی والا بولا۔ ''نو سال تک لڑلڑ کے ہم نے تُم لوگوں کے لئے یہ کولونی بنوا کے دی۔ تُم لوگوں کو جھونپڑ پٹی سے نکالا، سمینٹ کے پکّے مکان بنوا کر دیئے ہیں۔ اور اب تُم بولتا ہے..... ڈبّے میں بند کر دیا۔

میرا گھر والا، ہمیشہ پارٹی والے سے بحث کرتا تھا۔ ''تُو اسے بستی بولتا ہے۔ آدمیوں کا گودام لگتا ہے۔ سب کو پارسل میں پیک کر کے رکھ دیا ہے۔''

میں دانتوں میں دُوپٹہ دبائے سب سُنتی رہتی ہُوں۔ میرے کو کیا لینا ان لوگوں کی پولیٹکس سے؟ وہ بھی لگا رہتا ہے، میرا آدمی۔

''ارے سالا، دو بلڈنگ کے بیچ میں دو ہاتھ گاڑی کی جگہ تو ہونی چاہیئے۔ ادھر سے جاتا آدمی، اُدھر سے آتے آدمی سے ٹکرا جاتا ہے۔''

''کیا بات کرتا ہے میٹھو۔ پولس کا دو جیپ گذر سکتا ہے۔ تُو ناپ کے دیکھ لے۔''

Scanned by CamScanner

''ابے چھوڑ..... دو چار پائی بچھا کے تاش کھیل سکتا ہے کیا؟''

''اب بمبئی کی گلیاں چار پائی بچھانے کے لئے تو نہیں ہیں، دوست!''

میں بھی سوچتی ہُوں، سارا رنگ رُوپ ہی بدل گیا اس زمین کا۔ پہلے آدھا سال دلدل کی طرح کیچڑ رہتا تھا یہاں۔ کُچھ کھاڑی کا پانی آجاتا تھا۔ اور آدھے سال سُوکھے کیچڑ کی کالی مٹی اُڑتی تھی۔ ننگ، دھڑنگ بچے، کُتے، کُترے، جانی کی مُرغیاں اور مُرغے سب پل جاتے تھے۔ بچے، پلّوں کو رسّی باندھ کے گھسٹتے رہتے تھے۔ بڑے ہوتے ہوتے ان سب کتّوں کی گردن لمبی ہو جاتی تھیں۔

سرکار نے اب اس کی آدھی زمین پر، سمینٹ کی تین منزلہ پکّی بلڈنگ بنا دی ہیں۔ اور ایک ایک منزلہ پر چوبیس چوبیس فلیٹ ہیں۔ ہر ایک فلیٹ میں ایک کمرہ، ایک رسوئی گھر، جس میں دُھواں اُون کے گولے کی طرح لپٹا چلا جاتا ہے۔ ایک نل خانہ! اور ایک ایک بلڈنگ میں، ہر منزلہ پر دو پاخانے بنا دیئے ہیں۔ تاکہ پانی کے ڈبّے اُٹھا کر دُور نہ جانا پڑے۔ لائن اب بھی لگتی ہے۔ لیکن پہلے یہ لائن کھلے میں لگتی تھیں۔ اب دیوار سے لگے لگے سیڑھیاں چڑھ جاتی ہیں۔

جب یہ بلڈنگ بننی شروع ہُوئی تھی تو ساری جھونپڑپٹّیاں گھسیٹ کے، میدان کے ایک طرف رکھ دی گئی تھیں۔ جیسے غفار منڈی میں خالی ٹوکریوں کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ اُس کی ٹوکریوں میں سڑی ہُوئی سبزیاں رہ جاتی تھیں۔ اور اس ڈھیر میں گلے سڑے بچّے اور ان کے ماں باپ بلکتے رہتے تھے۔ بالکل ہی کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی تھی۔ دُھوپ بھی، اوس

Scanned by CamScanner

بھی، مینہا بھی۔ آسمان بھی اپنا بچا کھچا سب کچھ اُوپر سے پھینکتا رہتا تھا۔ اِن دیواروں پر تو کائی بھی نہیں لگتی۔ جھونپڑپٹیاں تو پھر بھی کافی سبز رہتی تھیں۔

ہماری جھونپڑی کے سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ تھی، جہاں سنتوش نے کریلے کی بیل لگا دی تھی۔ اور کھاپچیوں سے باندھ کے دیوار سی کھڑی کر لی تھی۔ اس سے ساتھ کی جھونپڑی بھی الگ ہوگئی تھی۔ لیکن بیل تو بیل ہی تھی۔ جہاں ساتھ والے کو (پڑوسی کو) دو کریلے نظر آئے، وہیں کپڑے دھونے کے بہانے بالٹی پانی کی رکھی اور موقع پاتے ہی ہاتھ ڈال کر کریلے چُرا لئے اور پانی کی بالٹی میں ہی کپڑوں کے نیچے رکھ کے اندر لے آئے۔ چار آلو اور ڈھیری لال مرچ ڈال کے بھون لئے، خوشبو تک نہیں اُڑتی تھی کریلے کی۔ کیسے جان پاتی سنتوش؟ مگر اُسے شک تو ہُوا تھا۔ اِسی لئے جب رجب علی کا گیرج گرایا گیا تھا میونسپلٹی نے، تو سنتوش کا خصم پتلے ٹین کی چادر لایا تھا اور بانس کی کھاپچیوں کے پیچھے ایسے کھڑی کر دی کے ساری بیل ہی چھپ گئی۔ اِسی لئے تو سنتوش کے یہاں سے کبھی کبھی کریلوں کی خوشبو بھی آجاتی تھی۔ اُسے لال مرچی سے چھپانی نہیں پڑتی تھی۔ ہاں مانگ لو تو کبھی کبھار دے بھی دیتی تھی۔ وہ بھی تو میرے گملوں میں لگے کچے ٹماٹر مانگ لیتی تھی۔ سبھی نے گھر کے باہر کچھ نہ کچھ کھڑا کر لیا تھا۔

'تُلسی' تو تھی ہی جس پر روز شام کو دیئے جل جاتے تھے۔ کسی کو پتا ہی نہیں وہ کیوں لگائی جاتی ہے۔ بتی کیوں جلاتے ہیں؟ امینہ کے یہاں بھی، کریماں کے یہاں بھی، شانتی اور پُوروکو یہاں بھی، سبھی کہتی تھیں۔ ''جب بھی بُوڑھا کھانسے، میں تو تُلسی ڈال کے کاڑھا پلا دیتی ہُوں۔''..... کچھ کی بیل تو جھونپڑی کی چھت پر بھی پھیل جاتی تھی۔

Scanned by CamScanner

مگر آنٹی تو آنٹی ہے نا، اس نے بھٹی رکھی تھی، چھوٹی سی۔ اپنی جھونپڑی کے پیچھے، بخشی کی طرح نہیں۔ جس نے میدان کے ایک کونے میں جگہ بنا رکھی تھی۔ پندرہ بیس روز میں ایک ہی بار بھٹی چڑھاتا تھا۔ دارُو کے ڈرم بھر کے جھگی میں، محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ جس روز اس کی بھٹی لگنی ہوتی تھی، اس روز صبح سے کچھ حولدار اس کے گھر کی طرف گھومتے نظر آنے لگتے تھے۔ اس کی دو جھونپڑیاں اور بھی تھیں۔ عزت دار لوگ اندر بیٹھ کے پیتے تھے۔ اور معمولی عزت والے، جو نہ اُترتی تھی، نہ چڑھتی تھی۔ وہ باہر بیٹھ کے ٹھرّا پیتے تھے۔ اور سامنے پلیٹ میں رکھا نمک چاٹتے رہتے تھے۔ لیکن آنٹی تو آنٹی تھی۔ وہ بڑی نفاست سے دارُو بناتی تھی۔ سڑے گلے پھل بھی ڈالتی تھی۔ اور 'نوسادر' تو بہت ہی کم۔ اس کی دارُو میں رنگ بھی ہوتا تھا۔ اور جو کوئی خالی بوتل ساتھ لے آئے، ایک روپیہ کم کر دیتی تھی۔ اس کے اپنے بندھے ہُوئے گراہک تھے۔ وہی آتے تھے اور دس بجے کے بعد کوئی نہیں۔ پھر وہ خود پی کے دُھت ہو جاتی تھی اور بڑے کا گوشت کھا کے سو جاتی تھی۔ کوئی جگا دے تو ایسی جھنکارتی گالیاں پڑتی تھیں کے ساری بستی میں رس ٹپک جاتا تھا۔

اب تو وہ بھی دیواروں میں بند ہو گئی ہے۔ اس کا تو گلا ہی گھُٹ گیا ہے۔ پہلے وہ اتنی اکیلی نہیں لگتی تھی۔

جانی بھی کہتا ہے اب ہوٹل کی نوکری پڑوڑتی نہیں۔ اُس کی مُرغیاں کُچھ بک گئیں، کُچھ کھا گئے، کُچھ مَر گئیں۔ اب دُوسرے اور تیسرے مالے پر مُرغیاں کہاں سے پالے؟

غفار نے بھی اس سال بکرا نہیں لیا۔ قربانی میں اپنی بکری کاٹ ڈالی۔ کہتا ہے، پہلے کھول دیتے تھے تو کچرپٹی میں اپنا چارہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ اب گھر کے کپڑے کھاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

مہینے میں دو لنگیاں کا خرچا بڑھ گیا ہے۔ گھر نہیں تھا تو کتنا اچھا تھا۔

میرا گھر والا بھی پہلے کچھ دوستوں یاروں کو ساتھ لے آتا تھا۔ جھونپڑی کے باہر، چار پائی ڈال کے سب پیتے تھے۔ ہلڑ کرتے تھے۔ اور جو لڑھک جاتا تھا، رات وہیں پڑ جاتا۔ صبح ڈیوٹی سے پہلے اُٹھ کے چلا جاتا۔ اب اس نے بھی دوستوں کو لانا چھوڑ دیا۔ ایک ہی کمرے میں سارے مرد اور عورتیں کیا کریں؟ تب بچے فرش پر پڑے رہتے تھے۔ مرد باہر سو جاتے تھے۔ عورتیں رات کو پانی بھر کے، اپنے اپنے ممیاتے بچوں کو چھاتی سے لپٹا کے سو جاتی تھیں۔ اب کیا کریں؟ بڑے بچے آنکھیں پھاڑے سب دیکھتے رہتے ہیں۔

میں تو کئی بار اپنے مرد سے کہہ چکی ہوں یہ بھی سالی کوئی زندگی ہے؟ ڈربوں میں بند کر دیا ہے سرکار نے۔ پتا ہے کیوں۔ تاکہ غریبی کی باس باہر نہ جائے۔ چل مکان بیچ کے، کہیں اور چلتے ہیں۔ کسی اور جھونپڑ پٹی میں جگہ مل جائے گی ____ !!

Scanned by CamScanner

جھڑی!

بارش کی جھڑی بھی کچھ اس طرح لگی تھی ممبئی میں، جیسے دامُو کو پینے کی جھڑی لگی تھی۔ پانچ روز سے لگاتار دن رات دارُو پیئے جا رہا تھا۔ اور پانچ روز سے آسمان بھی برسے ہی چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا دونوں کو چڑھی ہوئی ہے، اور کوئی رُکنے کو تیار نہیں تھا۔ ضد لگی ہوئی تھی۔

دامُوں کا ہمیشہ سے یہی حال تھا۔ دامُو ایسا ہی تھا۔ جب پینے پر آتا تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا تھا۔ بیس بیس دن، ایک ایک مہینہ، صبح و شام دارُو، بس دارُو۔ بیوی لکشمے کو روکتی جو دارُو دیتا تھا تو پتہ نہیں کہاں کہاں سے نکال لیتا تھا۔ بستر کے نیچے بچھی تلائی میں سے، دال کے ڈبے میں سے، چھت کے پائپ سے اور دم بھی بہت تھا پینے کا۔ پیتا تھا تو خوش رہتا تھا۔ اوروں کی طرح لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ اور جب چھوڑ دیتا تھا تو تین تین، چار چار مہینے، کبھی چھ چھ مہینے تک ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ تب اُس کے جیسا آدمی نہ ہوتا بستی میں۔ اُس کے جیسا باپ نہیں، اُس کے جیسا پتی نہیں۔ اُس کے جیسا ور کر بھی نہیں۔

Scanned by CamScanner

لیکن وہ تو موسم کی بات ہے۔ اس بار تو پہلی بارش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ اور بارش بھی، کیا بارش۔ پچھلے سو سال میں ایسی بارش نہیں ہوئی تھی۔

پہلا دن گذرا۔ برداشت کیا۔ ہمیشہ کی طرح ممبئی کی لوکل ٹرینیں بند ہوئیں۔ چلیں، پھر بند ہوئیں۔ دُوسرے دن باہر کے ٹرک آنے بند ہوئے۔ تیل ترکاری کی آمد بند ہوگئی۔ بھاؤ تاؤ نے خرگوشوں کی طرح کان کھڑے کر لئے۔ شاہراؤں پر ٹرکوں کی قطاریں رُکتی نظر آنے لگیں۔ بارش مسلسل جاری تھی ایک ہی رفتار سے۔ اور دامُو کا اُسی رفتار سے دارُو جاری تھا۔

تیسرے دن سے خطرے کے آثار دِکھائی دینے لگے۔ بارش، بارش کے ساتھ ہوا، گلی میں پانی بھرنا شروع ہوا۔ بیوی باہر کا سامان اُٹھا اُٹھا کر کھولی میں رکھنے لگی۔ بالشت بھر کی کھولی، جس میں دامُو، اُس کی بیوی سوبھا اور کشنی، جس کی اگلے مہینے شادی ہونے والی تھی، وہ ہی نہیں سماتے تھے، بیوی نے بکری کو بھی اندر لے لیا۔ دامُو چڑ گیا۔

''اب اس بھین..... کو اندر لانے کی کیا جروعت (ضرورت) تھی۔''

''باہر کھڑی کب تک بھیگتی رہتی؟''

''ابے! اتنا موٹا اُون کا کوٹ پہن رکھا ہے۔ دو گھنٹے بھیگ نہیں سکتی؟''

''دو گھنٹے کہتے ہو۔ دو دن ہو گئے ہیں پانی پڑتے۔ آج تو گلی بھی بھر گئی ہے اور نالا اتنے زور سے بہہ رہا ہے۔ مُجھے تو لگتا ہے پنیہ کی جھونپڑ پٹی سب جائے گی پانی میں۔''

دامُو چُپ ہو گیا۔ دائیں ہاتھ سے نمک چاٹا تھوڑا سا اور بائیں ہاتھ سے آدھا گلاس دارُو کا غٹک گیا۔ نوشادر سینے میں جا کے لگا۔ بھٹی والے کو گالی دی۔

''سالا، اتنا نوشادر ڈالنے لگا ہے دارُو میں۔ لگتا ہے بیٹری کا تیزاب ڈال دیا۔''

Scanned by CamScanner

سوبھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بکری کو ایک طرف باندھ کے، کشنی سے بولی:

''اُٹھ بیٹی۔ یہ فرش کا سامان تھوڑا تھوڑا اُٹھا کے اُوپر رکھ دے۔ تخت پہ ڈال دے۔ مجھے لگتا ہے پانی تھوڑا تو بھرے گا کھولی میں۔ بارش تو بند ہونے کی نہیں، اور تیز ہوگئی .....'' اُس نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ گلی میں ایک شور اُٹھا۔ ''لگتا ہے جھونپڑی گئی پنیہ کی۔''

سوبھا نے دروازے پر جا کر دیکھا۔ مقادم کی چھت پوری کی پوری پھسل کے گلی میں آپڑی تھی۔ لوگ بھاگے اُسے اُٹھانے کے لئے۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بجائے گلی سے بھرنے کے، پانی سیدھا اُوپر سے بھرنے لگا۔ آسمان بھی ضد میں تھا۔

کشنی نے جانا چاہا، لیکن سوبھا نے روک دیا۔ ''تُو بیٹھا اگلے مہینے لگن ہے۔ کہیں ہاتھ پیر توڑ کے آگئی تو .....'' کچھ اور کہتے کہتے سوبھا نکل گئی۔

دامُو کا جی چاہا بیٹی سے کوئی بات کرے۔ اب وہی تینوں تھے کھولی میں۔ دامُو کشنی اور بکری!''

''کاندہ ہے گھر میں بیٹی؟ ایک کاندہ کاٹ کے دے نا۔ نمک ڈال کے۔''

کشنی چُپ چاپ کاندہ کاٹنے میں لگ گئی۔ دامُو نے کھڑکی میں رکھی بوتل اُٹھائی اور پھر سے گلاس بھر لیا۔''

''مٹکی سے پانی بھی دے دے بیٹی۔''

بغیر کچھ کہے کشنی نے مگ بھر کے رکھ دیا۔ آدھا گلاس دارُو، آدھا گلاس پانی! کشنی لوٹ گئی تھی لیکن دامُو نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ کشنی کے سر پہ رکھا، جو کچھ دیر ہوا میں لہراتا رہا۔

Scanned by CamScanner

مخالف ہوا میں اڑتے پنچھی کی طرح، اور دُعا دی۔

''تُو پھکر نہیں کرنا بیٹی۔ بوت شان سے تیری لگن کروں گا۔ پچیس ہزار کی کھولی، پچیس ہزار کا کپڑا گہنا، پچیس ہزار تیرے مرد کو دُوں گا۔ پُورا ایک لاکھ لے کر آؤں گا۔ سب تیری لگن میں خرچ کر دُوں گا۔'' پھر خود ہی حساب ٹھیک کیا۔

''ایک لاکھ زیادہ ہو گیا کیا؟.... چل پچاس ہزار لاؤں گا۔''

پچیس ہزار بار، یہ بات وہ نشے میں دوہرا چُکا تھا۔ اور ہر بار سوبھا پھٹکار دیتی تھی۔ ''کہاں سے لائے گا؟ ریس میں جائے گا کیا؟ کہ چوری کرے گا؟''

ہر بار سوبھا بولتی ضرور تھی۔ اور وہ بھی ہر بار پینے کے بعد ایک بار تو اپنے انداز سے ضرور کشنی کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ اور یہی کہتا تھا: ''تُو پھکر مت کر.....''

کشنی کاندہ اور نمک رکھ کے پھر سامان ہٹانے میں لگ گئی۔ پانی اب کھولی کے اندر آنا شروع ہو گیا تھا۔ اور کچن والی چھت سے باقاعدہ نیچے رکھی بالٹی بج رہی تھی۔ بکری جو اتنی دیر بیٹھی ہوئی تھی پھر کھڑی ہو گئی۔

سوبھا بہت دیر تک نہیں آئی تو کشنی دیکھنے کو نکلی۔ وہ بھی آدھے گھنٹے کے لئے گُل ہو گئی۔ دامو کو بھی سامان کی فکر ہوئی۔ پہلے تو اُس نے اپنی ایک لیٹر دار و سنبھال کر اُوپر رکھ دی۔ جو دال کے ڈبے میں چھپا کے رکھی تھی وہ الگ۔ پھر پانی کا ایک بڑا والا جگ بھر کے رکھ لیا۔ پھر دو پیٹیاں، کپڑے لتے والی اُٹھا کر تخت پر رکھ دیں۔ تیسری پیٹی بہت بھاری تھی۔ گھسیٹنے میں پیر پہ لگ گئی۔ وہ وہیں چھوڑ دی۔

بکری بالکل کونے میں گھس کے کھڑی ہو گئی۔ جیسے نماز میں ہاتھ باندھے کھڑی

Scanned by CamScanner

ہو۔ایک ڈبے میں کُرمرے بھرے ہوئے تھے۔تھوڑے جیب میں بھر لئے۔تھوڑے مٹھی میں بھر کے پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔کھولی میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔

اس بار سوبھا لوٹی کشتی نہیں۔ساڑھی اُٹھا کے گھٹنوں سے اُوپر باندھ لی تھی۔چلا رہی تھی۔

''دیکھو آج گھر میں کھانا پکانا تو نہیں ہو سکتا۔نیچے ہوٹل، ملیئے کا، آدھا پانی میں بھر گیا ہے۔لوگ باگ اُوپر والے گیرجوں میں بھاگ رہے ہیں۔'' نشے میں تھا۔لیکن یاد رہا۔

''مقادم کا کیا ہوا؟ گھر تو بھر گیا ہوگا۔''

''بیچارا ابھی تک سامان اُٹھا اُٹھا کر اُوپر پہنچا رہا ہے۔ہیرو، گوپال، سلیمان سب لگے ہیں۔لیکن کیا کریں؟ بوڑھوں بچوں کو دیکھیں کہ سامان کو دیکھیں؟''

سوبھا کھانے پینے کا سامان اُٹھا اُٹھا کر اُوپر رکھتی جا رہی تھی۔وڑا پاؤ لائی تھی۔وہ بنا رہی تھی دامُو کے لئے۔اور کہہ رہی تھی: ''کتنے بچے پیدا کرتے ہیں محلّے والے۔ایک ایک سائیز کے دس دس بچے ملتے ہیں۔شکر ہے اپنی ایک ہی ہے!''

بیوی کے آنے سے دامُو میں جان آ گئی تھی۔سر کا پانی جھاڑ کر بولا: ''تیرا پیٹ نہیں گرنے لگتا تو اِدھر بھی لائن لگی ہوتی اب تک۔''

سوبھا نے بھی گردن مار کے کہا۔''بھگوان ہے نا بچانے والا! لو..... کھالو۔''

دامُو نے بازو سے پکڑ لیا۔ ''وہ کیا تیرے سگے والا ہے؟''

''اب ہاتھ چھوڑو۔'' سوبھا نے ڈپٹ کے کہا۔''اور یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔نیچے دیکھو۔کتنا پانی بھر رہا ہے۔''

Scanned by CamScanner

سو بھانے دو پیٹیوں کے اُوپر کھرچی رکھی تھی۔ دامُو دھیرے سے اُٹھ کے، اُس کے اُوپر چڑھ گیا۔

''اتنا اُونچا تو تیرے سگے والا بھی نہیں آسکتا۔ پانی کیا آئے گا۔''

''لڑھک مت جانا۔ یہاں اُٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔''

''تو کہاں جارہی ہے؟''

''گیرج والے چھپر میں۔ جرا ہاتھ بٹاؤں۔ کشنی بھی وہیں ہے۔''

''وہ کب آئے گی؟''

''جرا پانی تھمے تو سب لوگ لوٹیں گے۔''

لیکن اس بار کوئی نہیں تھما۔ نہ بارش نہ دامُو۔ گلی کے پانی کا بہاؤ بڑھتا ہی گیا۔ نالا دریا ہو چکا تھا۔ مقادم کا چھوٹا لڑکا پانی میں گرا اور غوطے کھاتا کھاتا بہہ گیا۔ کئی لوگ دوڑے لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔ اس دوڑ میں کچھ اور لوگ بھی زخمی ہوئے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جہاں پانی کا بھنور بن رہا تھا۔ وہاں کوئی ''مین ہول'' کھُلا تھا اور مقادم کا لڑکا اُسی میں کھچ گیا۔

گھروں سے بجلی چلی گئی تھی۔ یا بند کردی گئی تھی۔ شارٹ سرکٹ ہونے کا خطرہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے پانی کے ساتھ ساتھ شہر اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔

اُوپر کے دونوں تینوں گیرجوں میں چھ چھ فٹ تک پانی بھر گیا۔ جن گاڑیوں سے مرمّت کے لئے انجن نکلے ہوئے تھے اُن کے ڈھانچے قبروں کی طرح پانی پر تیر رہے تھے۔ چھت کے پاس پاس، سامان کے لئے بنے خانچوں سے سامان پانی میں پھینک کر کچھ لوگ اُن خانچوں میں گھُس گئے تھے اب جب تک بارش نہ تھمے اور پانی نہ اُترے، اُن کے نیچے

Scanned by CamScanner

اترنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

بالٹی جو بُوند بُوند بھری تھی اب وہ بھی پانی کے اوپر تیر رہی تھی۔ باہر سے بیچ بیچ میں جو بلّو لوگوں کا سُنائی دیتا تھا، وہ بھی دُور جا چُکا تھا۔ محلّہ خالی ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی شور کا ریلا اُٹھتا تھا جیسے کہیں کوئی میچ چل رہا ہو۔ کوئی وِکٹ گئی یا کسی نے چھکّا مارا۔ ورنہ ایک ہی مسلسل آواز چھپر کی، بارش کی، پانی کے بہاؤ کی، جیسے آسمان لوری سُنا رہا تھا، اور آنکھیں بھاری ہونے لگی تھیں۔

جو نکل سکے تھے وہ نکل گئے تھے، اور دُور بلڈنگوں کی چھتوں پر، ہسپتالوں کے برآمدوں میں، سکولوں کے کمروں میں جا کر پناہ لے رہے تھے۔ کشنی ہسپتال کے ایک برآمدے میں گھٹی بیٹھی تھی۔ اُسے کسی نے خبر نہیں دی۔ سوبھا کو لوگوں نے پانی میں ڈوبتے دیکھا تھا۔ کچھ کہتے ہیں، کسی سانپ نے ڈس لیا، جو کئی جگہ پانی میں تیرتے نظر آ رہے تھے۔

شام ڈھلنے سے پہلے دو نوجوان لڑکوں نے کمر میں رسّے باندھ کر دامو کی کھولی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ لیکن اندر داخل نہ ہو سکے۔ اُن کی گردنوں تک پانی آ چکا تھا۔ بکری دروازے میں اُلٹی اٹکی ہوئی تھی۔ مر چکی تھی۔ دیوار کے پاس کا انڈر کرنٹ (نچلا بہاؤ) بہت تیز تھا۔ پیچھے کی کھڑکی پانی میں ڈوب چکی تھی۔ دامو نے کسی طرح برتنوں والا ٹیبل (میز) تخت پر کھینچ کر، کُرسی (کھرچی) اُس کے اُوپر کھینچ لی تھی۔ کچھ برتن پانی کے اُوپر تیر رہے تھے۔ کچھ بہہ گئے۔ بارش اور پانی کے شور سے کان پھٹ رہے تھے۔ لڑکوں نے بہت آوازیں دیں دامو کو۔

لیکن وہ ایک ہاتھ میں بوتل پکڑے، دوسرے ہاتھ کی ایک لمبی لکڑی سے پانی پر

Scanned by CamScanner

تیرتے ٹماٹر اور کھیرے پکڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مچھلیوں کو گھیر رہا ہو، اور ہنس رہا تھا۔ باہر نکلنے کی، نہ اُس نے سُنی، نہ کہی، اور شاید سوچی بھی نہیں۔ وہ ابھی تک پانی کے اُوپر تھا۔ اور آسمان سے ضد لگی تھی۔ یہ جھڑی کون پہلے بند کرتا ہے!

Scanned by CamScanner

سارتھی

گیٹ وے آف انڈیا سے صُبح ساڑھے سات بجے پہلی سٹیم بوٹ چھوٹتی تھی، ایلی فینٹا کیوز کے لئے۔ اس لئے ماروتی کو ساڑھے چھ بجے پہنچنا پڑتا تھا۔ پہلے جھاڑو لگانا، مُسافروں کا پھینکا ہُوا کچرا اُٹھانا۔ پھر پانی سے دھونا پوری بوٹ کو، اور اُس کے بعد سُوکھے کپڑے سے تمام بینچ اور کُرسیاں خشک کرنا۔ روز مرّہ کا کام تھا۔ بوٹ کا مالک خوش تھا اُس کے کام سے۔ لیکن گالی بہت دیتا تھا۔ دل سے تو نہیں دیتا تھا لیکن زبان سے بھی کم گندی تو نہیں لگتی تھی؛ جب وہ ماں بہن ایک کرتا تھا۔ آدھی لُنگی مارے، ماتھے پر چوڑا ایک چھ اُنگلیا تِلک لگائے۔ بہت صُبح ہی بھگوان کو اُٹھا دیتا ہوگا.... بوٹ کی دُھلائی صفائی ہوتے ہوتے۔ تب تک کنارے پر مُسافروں کی بھیڑ جمع ہونا شُروع ہو جاتی تھی۔ پہلی بوٹ میں عموماً ایجنٹ لوگوں کے گروپ رہتے تھے اور بیشتر غیر مُلکی، امریکی، جاپانی بلکہ اکثر یہ ہوتا کہ پہلے گروپ کے لوگ تو سامنے تاج محل ہوٹل ہی سے نکل کر آ جاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بیگ پکڑے، ٹوپیاں لگائے، کیمرے اور دُوربینیں لٹکائے .... لیکن مُشکل ہوتی تھی جب پہلی بوٹ کی

Scanned by CamScanner

روانگی کے بعد دُوسری بوٹ کی صفائی کرنی پڑتی تھی۔ پہلی بوٹ کے بچے ہوئے لوگ اور دوسری بوٹ کا بڑھتا ہُوا گھٹیا درجے کے لوگوں کا ہجوم، دباؤ ڈال دیتا تھا۔ صُبح صُبح کی نرم اور تر گالیوں کے بعد اب خشک اور سنٹی کی طرح لہراتی ہوئی گالیاں برسنے لگتی تھی۔ جن کی تیزی دُھوپ کے ساتھ ساتھ چڑھنے لگتی تھی۔

تین کشتیاں تھی اُس کے مالک نرسنگھاراؤ کے پاس۔ ایلی فینٹا تک جانا، مُسافر اُتارنا، مُسافر بھرنا اور لوٹ لینا۔ گیٹ وے کی دھنیا چھونا اور پھر لوٹ لینا۔ مُسافروں کے چٹپٹے کھانوں کے مُچڑے ہوئے لفافے، مونگ پھلی، سنترے، چاکلیٹ اور ٹافیوں کے ریپر، مُسافروں کی اُلٹیاں، جھنجھلا کے پھینکے ہوئے نرود کے پیکٹ، ٹُوٹی ہوئی مالا کے دانے، کسی کی ٹوپی، کسی کا رُومال۔ مارُوتی کی باہیں تھک جاتی تھیں اُٹھاتے، جمع کرتے اور کچرے کے ڈرم میں بھرتے۔ سمندر میں پھینکنا منع تھا لیکن اُس نے کسی مُسافر کو ایسا کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ جتنا کام ہلکا ہو سکے، ہونے دو .... مُسافروں کی اُلٹیاں دھونے کا کام سب سے مُشکل تھا۔ پہلے پہل سمندر پہ سفر کرنے والوں کے لئے یہ عام روگ تھا۔ عادتاً لوگ سمندر کی طرف جھک کر قے کرتے تھے اور اس کوشش میں زیادہ تر اپنے کپڑوں اور بینچوں پر گرا دیتے تھے۔ ہائی ٹائیڈ میں تو بہت ہی بُرا حال ہوتا تھا لوگوں کا۔ کھایا پیا سب باہر آ جاتا۔ ٹنکی سے پانی بھر کے فوراً صاف کرنے کا حُکم تھا نرسنگھاراؤ کا۔ مارُوتی کی کمر دوہری ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو بوٹ کے سُپر یئر کی لات بھی پڑ جاتی تھی۔ بوٹ پر سب سے نچلے درجے کا تھا وہ، مہتر کہلاتا تھا۔ اس لئے کوئی کُچھ بھی کہہ دیتا تھا۔ انجن کے کیپٹن کھانا تو ڈبے میں لاتے تھے لیکن کھاتے برتنوں میں تھے اور اُسے دونوں ہی دھونے پڑتے تھے۔ برتن بھی ڈبہ بھی۔ اور واپسی سے پہلے اُن کی باسکیٹ بھی تیار کرنی پڑتی تھی۔

Scanned by CamScanner

مسلسل دس گھنٹے بوٹ پر ہلتے رہنے سے، سمندر کی ٹائیڈ کے ساتھ اِدھر اُدھر لڑھکتے رہنے اور اپنا توازن سنبھالنے سے جب شام کی آخری بوٹ واپس آ کر کنارے لگی تو ماروتی کے جسم کے سارے جوڑ ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اب بوٹ کو صاف کرنے کا دم نہ تھا اُس میں۔ نرسنگھارا ؤ نے ماں کی گالی سے پُکار کے کہا بھی۔

''ابے کیوں نہیں صفائی کر لیتا ابھی۔ صُبح صُبح جوکر آ کر پھر سے اپنی...! تیرا ہی کام بچے گا۔''

ماروتی میں جواب دینے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ ہاتھ جھلا کر ہی سمجھا دیا....

''صُبح کر لوں گا۔ اب دم نہیں ہے!''

بمبئی کی سڑکوں پر ٹھیلتی ہوئی بھیڑ میں چھلتا چھلاتا چرچ گیٹ کے سٹیشن سے آ کر لوکل پکڑی۔ تو کھڑے کھڑے گردن جھول گئی، آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جوگیشوری سٹیشن پر ہجوم نے اپنے آپ دھکیل کے باہر پھینک دیا۔ روز کا معمول تھا۔ اُس کا بھی، ہجوم کا بھی۔

کسی طرح خود کو ٹانگوں پر سنبھالے ہائی وے کے پاس پہاڑی پر بنے، ساونت نگر کے جھونپڑ پٹی کی کھولی نمبر ایک سونو میں داخل ہُوا۔ لکڑی کے تخت پر بکھرے میلے کپڑے، ڈبے سامان دھکیل کر، ڈھیر ہو گیا۔ تُلسی بائی کلسی سے تازہ پانی چمکتے ہوئے پیتل کے گلاس میں بھر کے لے آئی اور روز کی طرح وہی کہتی

''کائے رے، تھکلاس کا؟.... گھے پانڑی گھے۔

کہنی کے بل اُٹھ کر پانی کا گلاس غٹ غٹ کرتا پی گیا۔ تُلسی پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دھیرے دھیرے پاؤں دبانے لگی، اور سارے دن کی داستان بتا دی۔

Scanned by CamScanner

''لکشمی آئی تھی سُسرال سے سمدھی بھاؤ جی ناسک گئے ہیں۔'' ماروتی نے آنکھیں بند کرلیں۔ایک وقفہ گذرا۔تُلسی پھر بولی۔

''چھوٹی بہت دُشٹ ہوگئی ہے۔مُجھے تو نانی کہتی ہے،تُمہیں نام سے بُلاتی ہے۔ اپنی توتلی زبان میں کئی بار پُوچھا، ''مالُوتی' کب آئے گا؟'' ماروتی کے چہرے پر مُسکراہٹ آگئی۔

''ہندی بولتی ہے؟''

''ہاؤ۔''

''مراٹھی نہیں سیکھی؟''

''سیکھ جائے گی۔''

دن کی تھکان کُچھ کم ہونے لگی۔ہاتھ کھینچ کے سر کے نیچے رکھ لئے اور پُوچھا۔

''واپس کیسے گئی؟''

''واپس کہاں گئی۔فلم دیکھنے گئے ہیں۔''

''چھوٹی بھی؟''

''ہاں... چھوڑتی ہی نہیں ماں کو تو کیا کرتے؟ لے گئے ساتھ میں۔''

ماروتی 'ہُوں' کہہ کے چُپ ہوگیا۔ایک لمبی سانس لی۔

''اور کارتِک کہاں ہے؟''

''آج پھر سکول میں کسی سے لڑ کے آگیا۔''

''اُس کی تو ماں کی....''

ماروتی نے کروٹ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''سالا روز پٹ کے آجاتا ہے! گھاٹی کہیں کا! مراٹھیاں چی' ناک کاپلی۔''

Scanned by CamScanner

تُلسی بھی اُٹھ گئی۔ ''چلو، مُنہ ہاتھ دھولو۔ پھُوئے بنا کے رکھے ہیں۔ تھوڑے کھالو۔''

تولیہ کھینچا، اور موری میں نہانے بیٹھ گیا.... ''کُرتا دھوتی نکال دے میرا۔''

چولھا جل گیا۔ بتی جل گئی۔ ماروتی نے نہا کے کونے میں رکھی مُورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے، کُچھ بُدبُدایا اور دُھلا ہُوا دھوتی کُرتا پہن کر تیار ہوگیا۔ اتنے میں کارتک آ گیا۔

ٹانگ میں ہاتھ ڈال کے اُٹھایا، اُسے تخت پر پٹخا، اور دبالیا نیچے...

''چل سالا، کشتی لڑا پُن کے ساتھ۔'' کارتک کو گدگدی ہوئی۔ ماروتی بولا۔

''کل سے روز کڑوے تیل چی مالش کرا، اور اکھاڑے میں جا کے ورزش کرا۔ پستک پھستک پڑھ کے گیان دیو بن کے کُچھ نہیں ہوگا۔'' کارتک ہنستا رہا۔

تُلسی چُولھے پر بیٹھی بیٹھی بولی۔ ''کیا اُلٹی پٹی پڑھا رہے ہو اُسے۔''

''ٹھیک بول رہا ہُوں۔ مراٹھیاں چا پوت مراٹھا چ ہونار!''

اتنے میں بابو آ گیا۔ کھولی کے باہر سے آواز دی۔

''کیا ماروتی؟ پانکر کی میٹنگ میں چلنا ہے کہ نہیں؟''

ماروتی اندر ہی سے بولا۔

''دھت سالا۔ معلوم ہے اُس کی میٹنگ میں کیوں جاتا ہے؟ بائی بولتی ہے تُو سامنے بیٹھ کے رانیں کھجاتا رہتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

تلسی نے رسوئی میں بیٹھے بیٹھے دونوں مردوں کو موٹی سی گالی دی۔ ''بلکٹ سالے!''

ماروتی باہر نکل گیا۔ ''سُنی، میری بائی کی بولی سُنی...''

میٹنگ ختم ہونے کے بعد، دارُوخانے میں بیٹھ کر بہت بحث ہوئی۔ بابا امبیڈکر سے لے کر میدھا پاٹکر تک، چوہان سے لے کر پوار تک سب کے بال وپر سامنے بچھا کے رکھ دیئے گئے۔

آدھی رات جب گلی میں دو تین بیوڑے شور کرتے لوٹے تو تلسی پھر چارپائی چھوڑ کے اُٹھ گئی۔ سٹو وجلایا۔ اور کھانا گرم کرنے لگی۔ داماد گلی میں چارپائی پہ سو رہا تھا۔ ماروتی کی چارپائی ساتھ ہی میں بچھی ہوئی تھی۔ ماروتی ہنستا ہُوا اندر آیا۔ لکشمی چھوٹی کو لے کر سو رہی تھی۔ دونوں کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ چھوٹی کے گال ٹیپ دیئے۔

''مائوتی چی آئی۔''

تلسی نے ڈانٹا۔ ''اب اُسے جگانا مت۔''

کارتک تخت پر سو رہا تھا۔ لکشمی کی آنکھ کھُل گئی۔ اُٹھ کے باپُو کے گلے لگ گئی۔ چھوٹی بھی جاگ گئی۔ کارتک نے کروٹ لی اور بُڑبُڑایا... ''باپُو۔'' داماد نے آکر پرنام کیا۔

Scanned by CamScanner

اور ماروتی اُس وقت سٹیم بوٹ کا مہتر نہیں۔ اپنے پریوار کا کیپٹن لگ رہا تھا۔ اپنے سات گھوڑوں والے رتھ کا سارتھی!!

Scanned by CamScanner

فٹ پاتھ سے

دگڑو کو پھر اُسی کتے نے کاٹ لیا۔ تیسری بار۔ اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اُس کے جسم میں ایسی کون سی خوشبو بسی ہے، جو ''شینڈی'' کو پسند ہے۔ شینڈی کتے کا نام تھا۔

بہرام نے کہا: ''خوشبو نہیں بے، بُو آتی ہے اُسے۔ جو برداشت نہیں کر پاتا!''

دگڑو نے شِکایت کی، ''لیکن سوتا بھی تو میرے پاس ہی ہے! لاکھ بھگاتا ہوں، پتہ نہیں رات میں کب آ کے سالا میرے پاس سو جاتا ہے۔''

ہیرا پتہ نہیں کیا سوچ کے زور سے ہنس پڑی۔ بولی:

''تین بار بہت ہو گیا! ___ اِس کے بعد تُو کاٹنا اُسے۔''

باندرہ کے اِس فُٹ پاتھ پر ہیرا سب سے الگ چیز تھی۔ بہت کچھ کر لیتی تھی۔ سُورج سے پہلے اُٹھتی تھی اور دو گھنٹے میں کھار باندرہ کے آدھے سے زیادہ کچرے کے ڈبّے چھان آتی تھی۔ ڈبّہ ڈھکن جو ملتا بوری میں ڈال لیتی تھی۔ ایک دو بیئر کی بوتلیں مل جائیں تو اچھے پیسے بن جاتے تھے۔ ورنہ آج کل تو مالک لوگ ردّی کے پیپر بھی خود ہی بیچتے تھے۔ یہ

Scanned by CamScanner

اُسی کی کھوج تھی کہ ہسپتالوں کے پھینکے ہوئے اِنجکشن بھی بکنے لگے تھے۔ بڑی جان تھی ہیرا میں۔ سارا دن کچھ نہ کچھ لگی ہی رہتی تھی۔ ٹریفک جام ہو جائے تو، بیوڑے کا کھجلی بھرا بچہ اُٹھا کے گاڑیوں میں بھیک بھی مانگ آتی تھی۔ بیوڑا بچے کا کرایہ لے لیتا تھا۔

جب بالو تھا تو رات کو دو اینٹیں رکھ کے، بھیک بھی گرم کرتی تھی۔ بیکری والے سے پاؤ روٹی بھی لے آتی تھی۔ کھاپی کے ایک کٹے، کنستر جیسا پتیلہ تھا، کچھ الومونیم کے برتن تھے۔ پیچھے کھاڑی کے پانی میں دھو کے، اُوپر ٹانگ دیتی تھی پیڑ پر! جب سے بالو اُسے چھوڑ کر دادر میں 'دوسری' کے ساتھ جا کر بس گیا تھا، اُس نے روٹی ووٹی پکانا چھوڑ دیا تھا، کس کے لئے کرتی؟ بالو سے بہت لگاؤ تھا اُسے۔ اُنہیں دِنوں بھیکو کو سُونگھ لگ گئی۔ تبھی سے بھیکو اُس کے پیچھے لگا تھا، اُس کی 'اپنی' تو چلنے پھرنے سے بھی لاچار تھی۔ دن رات جھونپڑی میں پڑی رہتی تھی۔

بھیکو دل کا بُرا نہیں تھا، لیکن وہی شینڈی کی دُم کی طرح ٹیڑھے کا ٹیڑھا! اور اُسی کی طرح کھجاتا ہوا، ہر دُوسرے تیسرے آدھمکتا تھا۔ وہ ماہم والے فٹ پاتھ کا رہنے والا تھا۔ ایک بار بڑی بھاری بارشیں آئیں ممبئی میں۔ سارے فُٹ پاتھ بہہ گئے۔ سبھی کو دُوسرے ٹھکانے ڈھونڈنے پڑے۔ بھیکو نے بڑا ساتھ دِیا۔ تِلک برج کے نیچے ایک جگہ بنادی۔ اُس کی ماہم والی جھونپڑی سے بہت دُور بھی نہیں تھی۔ بس اُنہیں بارشوں میں اُس نے دو بار کاٹا تھا اُسے۔ اچھا ہوا، دو مہینے بعد اپنے آپ پیٹ گر گیا ہیرا کا۔ اور وہ واپس باندرہ والے فُٹ پاتھ پر آ گئی۔ دگڑو، شینڈی اور بیوڑے کے پاس۔ یہ مرد، سب ایک سے ہوتے ہیں۔ کہتا تھا، وارث چاہئے۔ ایک جھونپڑی اور ایک کپڑے ٹانگنے کی رسّی لئے

Scanned by CamScanner

گھومتا تھا اور وارث چاہیئے !!

بہرام کی عادتیں فٹ پاتھیوں جیسی نہیں تھیں، کم بولتا تھا لیکن اندر بڑے پیچ تھے۔ وہ کار والوں سے بڑے پنگے لیا کرتا تھا۔ موڑ مُڑتی ہوئی کار سے ٹکرا کے ایسے گرتا تھا کہ لگتا تھا جان ہی چلی گئی۔ لوگ جمع ہوتے۔ بلّا مچ جاتا۔ کار والا ہاتھ جوڑ کے پیسے دے جاتا۔ دیر رات کو، ہوٹل کے باہر کسی ایسی گاڑی والے سے پنگا لینا جو پی کے نکل رہا ہو یا جس کے ساتھ کوئی عورت ہو ____ کہتا تھا:

''ایسے لوگ بڑی جلدی بٹوہ ڈھیلا کرتے ہیں۔ آسامی چھوٹی ہے کہ موٹی بٹوے سے پتہ چل جاتا ہے۔''

کوئی بہت بڑا ہاتھ لگتا تو بہرام کئی کئی دن اپنے فٹ پاتھ سے غائب رہتا۔ سیدھا سائن کی 'جھگی والیوں' کے ہاں جا بستا۔ دن بھی وہیں، رات بھی وہیں۔ طبیعت سے بڑا ریئس تھا۔ وہاں اُس کی کوئی دل پسند بھی تھی۔ لیکن نام کبھی نہیں بتایا۔ ایک بار اتنا کہا تھا۔

''چاندی کے کانٹے بنا کے دیئے۔ ماں قسم کیا لگتی تھی۔''

''شادی کیوں نہیں بنا لیتا؟'' ہیرا نے کہا تھا۔

ذرا مُسکرایا۔ بولا:

''کمائے گا کون؟''

اُنہیں دِنوں اُس نے سُنا، بالو، 'دُوسری' کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا۔ کہاں گیا،

Scanned by CamScanner

پتہ نہیں۔'دُوسری' گنڈاسا لے کر ہیرا پر چڑھ آئی۔

''کہاں ہے کھسم تیرا۔سالا کُتا! ذات پات تو چھوڑی، دھرم شرم بھی چھوڑ گیا۔ ماں بیٹی دونوں کے ساتھ...'' اور کیا کچھ نہیں کہا اُس نے۔جب بولتی تھی تو لمبے لمبے دانت باہر آجاتے۔اور جبڑا پُورا کھُل جاتا۔شینڈی کی طرح!

ویسے ہیرا دل میں بہت خوش تھی۔پن بولی نہیں۔ایک ہی جھٹکے میں بالوں سے پکڑ کے گرالیا اُس نے۔اور اُسی کا گنڈاسا گردن پہ رکھ دیا۔

''بھین کی... بھُون کے شینڈی کو ڈال دُوں گی پھر کبھی اِس فُٹ پاتھ پر آئی تو!'' ___ وہ دن اور یہ دن، پھر نہیں آئی بالو کی وہ... کیا نام تھا... دُوسری!

بھیکو اُس دن بھی آیا تھا۔ہیرا نے روٹی نہیں ڈالی۔دِل میں غم تو تھا۔بالو واپس نہیں آیا۔اب دو عورت دُور ہو گیا تھا۔بھیکو نے اُسی بات کو ہوا دی۔

''مجھے تو معلوم تھا، وہ حرام کا ایسا ہی ہے۔یاد ہے کیرلہ کی ایک لڑکی آئی تھی فُٹ پاتھ پر، تو بالو مجور (مزدُور) کلاس میں سونے لگ گیا تھا۔''

ہیرا چُپ چاپ سُنتی رہی۔اور وہ بولتا رہا۔

''جہاں ہڈّی بوٹی دیکھی، وہیں دُم ہلاتا چل دیتا ہے۔تیرا کیا خیال ہے، اُس چھوکری کے ساتھ رہے گا دیول میں؟''

''کس دیول میں؟''

''کلیان میں! سائیں کا دیول ہے نا!''

ہیرا کو پتہ نہیں کیا سُوجھی۔ایک روز چل دی وہاں۔اور بھیکو کو ساتھ لے گئی۔

Scanned by CamScanner

ڈھائی سو سیڑھی چڑھ کے بھی بالو نہیں ملا۔ سارا دیول ڈھونڈا، چوگردہ ڈھونڈا، نو دن رہی وہاں بھیکو کے ساتھ۔ نہ سائیں ملا نہ بالو۔ وہ تیسری بار تھا بھیکو نے کاٹ کھایا۔ اِس بار تو بوٹی ہی نوچ کے لے گیا۔ اگری پاڑے والی دائی نے پیٹ صاف کیا۔ ڈیڑھ مہینہ، نہ بھیک مانگی، نہ اور کوئی دھندہ کیا ___ !

بھیکو سے رُوٹھ گئی وہ۔ تنگ آ گئی اُس سے۔ جب آتا بھگا دیتی۔ بس لات ہی نہیں ماری اُس کی.... ! پھر بھی پتہ نہیں ہر دُوسرے چوتھے، رات کے اندھیرے میں آتا، اور اُس سے لگ کے پڑا رہتا تھا۔ بدبُو آنے لگی تھی اُس سے۔ ویسی ہی جیسی دگڑو کو شینڈی سے آتی تھی۔

اچانک ہی بھیکو کی 'اپنی' مر گئی۔ مری تو نام بتایا 'سیتا'! جیسی بھی تھی، بھیکو نے سیوا بہت کی تھی اُس کی۔ بہت سمان دیا اُسے۔ پُورے پیسے دیئے اور شمشان میں لے جا کر جلایا۔ ہیرا کا دِل پسیج گیا۔ کچھ دن کے لئے ماہم والی جھونپڑی میں آ کر رہ گئی۔ ایک بار تو جی چاہا اُسی کے ساتھ بس جائے۔ انت تو اچھا ہوگا۔ لیکن سیتا کے مرنے کے بعد سے بھیکو بکھر گیا تھا۔ کہاں تو ہمیشہ رات کو اُس کے پاس آ کر پڑا رہتا تھا، اور اب رات کو غائب ہوتا تو کئی کئی دن بعد لوٹتا تھا۔ کچھ جادُو ٹونے والوں کے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔ کوئی تانترک سادھوؤں کی ٹولی مِل گئی تھی۔ پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ سیتا کو بہت یاد کرتا تھا۔

بارہ مہینے کے بعد کی بات ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا، ہیرا اپنے باندرہ والے فُٹ پاتھ پر واپس لوٹ آئی۔ دگڑو کی تو ٹانگ ہی ناسُور ہو گئی تھی۔

بہرام نے کئی بار کہا تھا: ''ابے مونسپلٹی میں چلا جا، انجکشن لگوا لے۔ نہیں تو کسی

Scanned by CamScanner

دن بھونکتا ہوا اُٹھے گا۔"

لیکن دگڑو نہیں گیا۔

ہیرا نے بھی کہا: "چلا جا، نہیں تو کسی دن ٹانگ کٹوانی پڑ جائے گی۔"

اور وہی ہوا ___!

جس دن ٹانگ کٹی، ہیرا ساتھ میں تھی۔ پہلے تو بے ہوش کیا اُسے۔ اور پھر پُورا دن لگ گیا ہوش میں آتے۔ جب ہوش میں آیا تو بہت رویا۔ ہسپتال والوں نے پُورے پچیس دن رکھا۔ ہیرا بتاتی تھی:

"مان نہ مان، شینڈی پچیس دن تک ہسپتال کے باہر بیٹھا رہا۔"

ہسپتال سے آئی تو ہیرا، دگڑو اور شینڈی کے ساتھ ہی بس گئی۔ ہیرا نے پھر سے المونیم کے کچھ برتن جوڑ لئے۔ ایک کونے میں چار اینٹوں کا چُولھا بھی بنالیا۔ اور دگڑو کے لئے پکانے بھی لگ گئی۔ پھر، سورج سے پہلے اُٹھنے لگی تھی۔ اور کھار باندرہ کے آدھے سے زیادہ کچرے کے ڈبے چھان آتی۔

پتہ نہیں کیسے ایک دن، ایک گاڑی نے شینڈی کو اُڑا دیا۔ بڑی تکلیف ہوئی دونوں کو۔ ہیرا ابھی بہت روئی۔ اُس دن بولی: "جب بھیکو مرا تھا گاڑی سے ٹکرا کے، ایسا ہی ہُوا تھا۔"

دگڑو نے پوچھا: "کیا ہوا تھا؟"

"رات کو اُٹھا تھا پیشاب کرنے کے لئے۔ سڑک کے پار جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف۔ اُدھر سے ایک کار آئی۔ بہت تیز ___ اور اُڑا دیا۔ گرا جب اُوپر سے نکل گئی۔

Scanned by CamScanner

روکا بھی نہیں سالے نے! صبح میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ اِدھر اُدھر پوچھا۔ میں بولی نہیں۔ کیا کرتی؟ کون جاتا پولیس میں؟ اور پھر لاش لے کر جلاتا کون؟ میونسپلٹی کی گاڑی لے گئی۔ ایسے ہی، جیسے شینڈی کو گھسیٹ کے لے گئی! فٹ پاتھ کی زندگی سالی ایسی اچ ہے!''

Scanned by CamScanner

آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا، سپنوں کی سرحد ہوتی نہیں
بند آنکھوں سے روز مَیں سرحد پار چلا جاتا ہوں ___

Scanned by CamScanner

ایل۔۔او۔ سی۔

(LOC)

1948 کی جھڑپ کے بعد ___ ہندوستان کے بارڈر پر، فوجیں تقریباً بس چکی تھیں۔ بیریکیں (Barracks) بھی پکی ہوگئی تھیں اور بنکر بھی ___ 1965 تک کے پندرہ سالوں میں، ایک روایت سی بن گئی تھی، فوجی ٹکڑیوں کے آنے، بسنے اور وداع ہونے کی۔ بارڈر کی زندگی نے اپنے آپ ایک نظام بنا لیا تھا۔ دونوں طرف کی دُھواں دار تقریروں کے پیچھے، بندوقوں کی آئرنگ فائرنگ کا معمول بھی بن گیا تھا۔ نارمل معمول یہی تھا کے جب بھی کوئی وزیر دورے پر آتا، تو آس پاس کے علاقوں میں فوجی فائرنگ کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی کسی گاؤں میں گھس کر کچھ بھیڑ بکریاں اُٹھا کر لے جاتے اور رات کو کیمپ میں دعوت ہو جاتی۔ کچھ سیویلین (civilian) مارے جاتے، تو اخباروں کو سُرخیاں مِل جاتیں اور لیڈروں کو تقریروں کے لئے مواد مِل جاتا۔ LOC ایک زندہ تار کی طرح سُلگتی رہتی۔ کبھی بہت بڑا وقفہ آجاتا اِس آپسی جنگ بازی میں، تو لگتا

Scanned by CamScanner

جیسے رسم وراہ ہی نہیں رہی۔ تعلقات ٹھنڈے پڑ گئے۔ تعلقات تازہ کرنے کے لئے، پھر کچھ دِن آتش بازی کر لیتے، خُون گرم ہو جاتا۔ کچھ جوان اِدھر مارے جاتے، اور کچھ جوان اُدھر مارے جاتے۔ خبروں میں ایک گنتی کا ذِکر ہوتا، پانچ اِدھر مارے گئے، سات اُس طرف ___ اور جمع تفرق کا حساب بن جاتا۔

دونوں طرف کے بنکر بھی کوئی دُور نہیں تھے۔ کبھی یُوں بھی ہوتا تھا کہ اِدھر کی پہاڑی سے، کسی نے کوئی بولی یا ماہیا گا دیا۔

''دو پتر اناراں دے
ساڈھی گلی لنگ ماہیا
حال پُچھ جا بماراں دے!''

تو اِدھر کے سپاہی نے گا کے جواب دیا۔

''دو پتر اناراں دے
پہرے نہیں ہڈ دے چناں
تیرے بھیڑے بھیڑے یاراں دے۔''

آمنے سامنے کی پہاڑیاں بھی، بس کندھوں ہی کی دُوری پر تھیں۔ جُھک جائیں تو شاید گلے ہی لگ جائیں۔ اُدھر کی اذان اِس طرف سُنائی دیتی تھی۔ اور اِدھر کی اُس طرف۔

میجر کُلونت سنگھ نے ایک بار اپنے ہُونیر کیپٹن سے پُوچھا بھی تھا۔

Scanned by CamScanner

''اوئے، اپنی طرف تو بانگ ایک ہی بار ہُوا کرتی تھی۔ یہ آدھے گھنٹے بعد پھر کیسے شُروع ہو گئی ....؟'' مجید ہنس پڑا تھا۔

''اُس طرف کی ہے سر! پاکستان کا وقت ہم سے آدھا گھنٹہ پیچھے ہے نہ''

''تو تُم کون سی بانگ پر نماز پڑھنے جاتے ہو؟''

''جو جس دِن سُوٹ کر جائے، سر!'' اور سیلُوٹ مار کے چلا گیا تھا۔

گُلونت نے کہا تھا، اُس نوجوان کیپٹن مجید میں کوئی بات تو ہے کہ بڑی جلدی مُنہ لگ گیا۔ اُس کی مُسکراہٹ یُوں بولتی تھی جیسے میرا ہی ہاتھ پکڑ کے بڑا ہُوا ہے۔

ایک روز مجید احمد، رات کے وقت اِجازت لے کر اُس کے خیمے میں داخل ہُوا اور ایک ٹفن لا کر دِیا۔

''کیا ہے؟''

''گوشت ہے سر، گھر میں پکایا ہے۔''

گُلونت اپنا گلاس تپائی پہ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔

''اچھا؟ ___ اچانک یہ کیسے بھئی؟''

''آج بقر عید تھی سر! قُربانی کا گوشت ہے کھائیں گے نہ؟''

''ہاں بھئی کیوں نہیں ___''

گُلونت نے خُود اُٹھ کر ٹفن کھولا اور بھُنے گوشت کی ایک بوٹی نِکالتے ہُوئے کہا....

''میک اے ڈِرنک فور یور سیلف!''

''نو سر! تھینک یُو سر!''

''کم اون ___ ڈِرنک بناؤ۔ اور عید مُبارک!'' بوٹی ہاتھ میں جھلاتے ہُوئے

Scanned by CamScanner

وہ تین بار مجید کے گلے مِلا تھا۔

''کِسی زمانے میں بھتو ماسی کھِلایا کرتی تھی، مُشتاق کی امّی، سہارن پُور میں۔ کالے چنے کی گھُنگھنیاں اور بھُنا گوشت کھایا ہے کبھی؟''

مجید کُچھ کہتے کہتے رُک گیا ____ پھر بولا۔

''میری بہن نے بھیجا ہے سر!''

''وہ یہاں ہے؟ کشمیر میں؟''

''سر ہے یہیں، کشمیر میں لیکن .....''

''لیکن کیا؟''

''زرگُل میں ہے، اُس طرف!''

''ارے؟'' کُلونت دائیں ہاتھ سے بوٹی چُوس رہا تھا، اور بائیں ہاتھ سے اُس نے وہسکی کا گلاس بنا کر مجید کو پیش کیا۔

''چیئرز ____ اور پھر سے عید مُبارک!''

چیئرز کے بعد کُلونت نے پھر پُوچھا ____ '' تو ٹِفن بھیجا کیسے تُمہاری بہن نے ____؟''

مجید تھوڑا سا بے چین (Uncomfortable) محسوس کرنے لگا کُلونت نے فوجیوں کی طرح سختی سے پُوچھا۔

''تُم گئے تھے اُس طرف؟''

''نوسر! ____ نیور، ہرگز نہیں!''

''تو ____!''

''میرے بہنوئی اُس طرف لیفٹیننٹ کمانڈر ہیں۔ بہن ملنے آئی تھی۔''

Scanned by CamScanner

کُلونت نے گلاس اُٹھایا، سِپ لیا۔ ٹِفن بند کیا اور مُڑ کے مجید کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاؤ ڈِڈ یُو مینیج دیٹ؟ ____ کیا بندوبست کیا تھا؟''

مجید چُپ رہا۔

''کیا بندوبست تھا؟''

رُکتے رُکتے مجید نے بتایا .....

''نیچے گاؤں میں بہت سے لوگ ہیں جن کے گھر اِس طرف ہیں اور کھیتیاں اُس طرف۔ اِسی طرح اُس طرف بھی ایسے ہی کُچھ گاؤں ہیں، جن کے گھر اور کھیت بٹے ہُوئے ہیں۔ خاندان بھی، رشتہ دار بھی۔ ''

الفاظ سے زیادہ کُلونت سنگھ کو کیپٹن مجید کی آواز پر یقین تھا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد کُلونت نے جب پلیٹ میں گوشت نِکالا، تو مجید نے بتایا۔

''اُس طرف کے کمانڈر آپ کے دوست ہیں سر ! میں نے آپ کا ایک آرٹیکل پڑھا تھا اِس لئے جانتا ہُوں۔''

کُلونت سنگھ کا ہاتھ رُک گیا۔ فوراً ایک نام کا شک ہُوا اُسے۔ اور جب مجید نے نام لیا تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''مُشتاق احمد کھوکھر ____ سہارن پُور سے!''

کُلونت کا ہاتھ کانپ گیا۔ اور وہ خیمے کی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ____ باہر کُچھ فوجی قدم مِلا کر کیمپ کراس کر رہے تھے۔ مجید نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''کمانڈر مُشتاق احمد، میری بہن کے سسُر ہیں سر !''

Scanned by CamScanner

''سسُر ____ ؟ اوئے نسیمہ کے بیٹے سے شادی ہُوئی تُمہاری بہن کی ؟''

''جی ____ !''

کُلونت نے تیزی سے کہا ! ''اوئے تُو.....'' اِس سے آگے وہ کُچھ نہیں کہہ پایا، اُس کا گلا رُندھ گیا۔

کُلونت نے جب گلاس اُٹھایا تو لگا وہ کُچھ نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مُشتاق اور کُلونت دونوں سہارن پُور کے تھے۔ کِسی زمانے میں ایک ساتھ ''دُون کالج'' میں پڑھتے تھے۔ اور دونوں نے ''دُون مِلیٹری ایکڈمی '' میں ٹریننگ لی تھی۔ مُشتاق کی امّی اور کُلونت کی بے جی بڑی پکّی سہلیاں تھیں۔ پھر مُلک تقسیم ہو گیا۔ فوجیں بھی تقسیم ہو گئیں۔ مُشتاق اپنے خاندان سمیت پاکستان چلا گیا۔ اور کُلونت یہیں رہا۔ دونوں خاندانوں میں اُس کے بعد کوئی میل نہ رہا۔

چند روز بعد کُلونت نے اپنے ایک جُونیئر وِشوا کو ساتھ لِیا اور کیمپ سے دُور ایک پہاڑی کی آڑ سے اُس نے مُشتاق کو وائرلیس پر کونٹیکٹ کر لِیا۔ کُچھ حیرانی کے بعد دونوں دوستوں نے پنجابی میں ایسی چُنی چُنی گالیاں دیں ایک دُوسرے کو، کہ دونوں کے سینے کھُل گئے اور آنکھیں بہنے لگیں۔ جب سانس میں سانس آئی تو کُلونت نے پُوچھا۔

''پھتو ماسی کیسی ہیں؟''

مُشتاق نے بتایا امّی بہت ضعیف ہو گئی ہیں۔ ایک منّت مانگی تھی اُنہوں نے کہ اجمیر شریف جا کر ''خواجہ معین الدین چشتیؒ'' کے مزار پہ اپنے ہاتھوں سے چادر چڑھائیں گی۔ دِن رات منّت کو ترستی ہیں۔ اور رابعہ بچّوں کو چھوڑ کر جا نہیں سکتی۔ رابعہ کو تُو نہیں جانتا۔''

Scanned by CamScanner

''جانتا ہُوں! مجید کی بہن ہے رابعہ، ہے نا؟''

''تُجھے کیسے معلُوم ؟''

''مجید میرا جُونیئر ہے بھئی ____!''

'' اوئے ____!'' پھر ایک لمبی سی بوچھاڑ، گالیوں کے ساتھ، آنکھوں سے گذر گئی۔

''اُس کا خیال رکھیو اوئے .....'' مُشتاق نے رُندھے گلے سے کہا۔

پھر دونوں میں طے پایا، کہ مُشتاق کسی طرح امّی کو واگھا تک پہنچا دے گا۔ وہاں سے، کُلونت کی بیوی، سنتوش آ کر اُنہیں دِلّی لے جائے گی، اپنے گھر۔ اجمیر شریف کی زیارت کرا دے گی اور جا کر سہارن پُور چھوڑ آئے گی،

بے جی کے پاس۔ امّی کے ساتھ کُچھ دِن بہُت اچھے کٹیں گے۔ مُشتاق کے سینے سے بہُت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

پھر ایک روز ____ مُشتاق کا پیغام آیا، امّی کو ویزا مِل گیا ہے۔ کُلونت نے سنتوش کے ساتھ (بارڈر پر ملنے کی) تاریخ طے کر دی۔ سب اِنتظام ہو چُکے تھے، بس مُشتاق کو خبر کرنا باقی تھا۔ اُسی دِن ڈیفنس مِنسٹر LOC پر آ دھمکے اور دونوں طرف سے طاقت کے مُظاہرے شروع ہو گئے۔ کُلونت جانتا تھا کے یہ جھکڑ دو ایک روز میں گذر جائے گا۔ وائرلیس پر نہ بھی رابطہ قائم ہُوا تو کیا ____! نیچے گاؤں میں جا کر کسی کو اُس طرف بھیجنے کی ہی تو بات ہے۔ مجید کو وسیلہ بھی پتہ ہے۔

پھر بھی فِکر نہ گئی۔ سنتوش بتاتی تھی کہ اب تو بے جی روز ڈاک خانے سے فون کر کے پُوچھ لیتی ہیں۔

''نی پھتو آ رہی ہے نہ ؟ ____ تُو واگھا پہنچ جائے گی۔ پہچان لے گی کہ میں

Scanned by CamScanner

ساتھ چلوں ؟''

مجید نے خبر دی ــــ ''سر پاکستان کی طرف سے شیلنگ بہُت تیز ہو گئی ہے۔''

گُلونت چڑا ہُوا بیٹھا تھا ــــــ بولا۔

''او کھسمانوں کھائے پاکستان، پھتو ماسی کا کیا ہوگا ؟''

پہلی ستمبر کے دِن، پاکستانی فوجوں نے ''چھمب'' پر حملہ کیا اور LOC کے اندر چلی آئیں۔

28 اگست ہندوستانی فوجوں نے ''حاجی پیر'' اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اُسی دِن کی خبر ہے، 28 اگست 1965 ــــــ

.... سہارن پُور میں پھتو ماسی گھُنگھنیاں والا گوشت پکا رہی تھیں۔ بے جی نے کالے چنے اُبالے تھے۔ اور LOC پر گیارہ فوجی ہلاک ہو گئے، جن میں ایک میجر گُلونت سنگھ تھا۔

اَوور

بُجھارت سنگھ کو وائرلیس پر بات کرتے کرتے، ایسی عادت ہوگئی تھی کہ کوئی بات ہو، ختم کرتے ہی، ''اَوور'' بول دیتا تھا۔ ہم اُس کے پاس کھڑے تھے، بولا، ''آپ جی، اُدھر سے چارپائی کھینچ کے بیٹھ جاؤنا! اَوور !!''

ہم لوگوں نے چارپائی کھینچ لی۔ گوپی نے پھُسپھُسا کے پُوچھا مُجھ سے۔

''بُجھارت سنگھ بھی کیا نام ہُوا؟'' میں نے کندھے جھٹک دیئے۔ ''اب ہے تو ہے''۔ بُجھارت سنگھ دیر سے ایک وائرلیس پر بات کر رہا تھا۔

''چار ہٹے کٹے آدمی دٹھال کے اُس کی پیٹھ پہ، اور بھگا لے سسُرے کو۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ اَوور!'' پھر اُدھر سے کُچھ جواب آ رہا تھا..... اِس بیچ میں اُس نے بیڑی جلالی۔ سُن کر فوراً بولا! ''ٹانگوں میں رسّی باندھ کے ڈنڈے سے دوڑا لیجیو۔ کم سے کم ایک کوس دوڑائیو۔ اَوور!''

Scanned by CamScanner

پھر وقفہ سُننے کا ___ پھر بولا: ''ارے بھُگار کھنے سے کُچھ نا ہوگا۔ مر جائے گا، بے فضول میں۔ تُو بھی تو بے وقوفی کی بات کرے ہے۔ اُودرا!''

وہ دُوسرے کسی کیمپ میں، کسی پگلائے ہوئے اُونٹ کو قابُو کرنے کی ترکیب بتا رہا تھا۔ میں اور گوپی لالٹین کی دُوسری طرف صبر کر کے بیٹھ گئے....

یہ جگہ 'پوچینہ' سے کوئی چالیس کلومیٹر دُور تھی۔ ہم لوگ پوچینا گئے تھے، ایک فلم شُوٹنگ کے لئے۔ ہندوستان، پاکستان کے بارڈر پر۔ ریگستان میں بس چھوٹی سی ایک چوکی ہے۔ بہت ہی خوبصورت گاؤں ہے۔ دیکھیں تو کسی بچّے کی 'ڈرائنگ بک' میں 'کریون' سے بنائے ہُوئے گھر لگتے ہیں۔ چوکی بھی کچّے سے مکان کی شکل ہے، اندر اینٹیں ہیں۔ اُوپر مٹّی سے لِپا ہُوا ہے۔ دو کمرے ہیں، بیرک جیسے، ایک دیوار میں چوکور کھانچا کٹا ہُوا ہے۔ جس میں بندوق ٹِکا کے، ایک فوجی، پوری وردی پہن کے کھڑا رہتا ہے۔ خوامخواہ سا! باقی سب کُچھ بنیانوں میں اِدھر اُدھر گھُومتے رہتے ہیں دُھوپ میں، یا آپس میں سرسوں کے تیل کی مالش کرتے ہیں اور.... ڈنڈ پیلتے ہیں۔ ہماری ہیروئین کے پہُنچنے سے بیچاروں کو کپڑے پہننے پڑ گئے۔ کنگھی، پٹّی کرنی پڑ گئی۔ ہمارے ڈائریکٹر صاحب نے بڑی کھوج کر یہ لوکیشن نکالی تھی۔ کہیں بھی کھڑے ہو جائیں، کسی طرف دیکھ لیں، دُور دُور تک لہراتا ہُوا ریگستان نظر آتا ہے۔ اور ہوا بار بار سہلا کر، اُس کی سلوٹیں صاف کرتی رہتی ہیں۔

اِس چوکی سے کوئی دو فرلانگ دُور، ایک سمینٹ کا پتّھر لگا ہُوا ہے، جس کے ایک طرف بھارت لکھا ہے، دُوسری طرف پاکستان۔ ایسے پتّھر، دو دو فرلانگ کے فاصلے پر لگا دیئے گئے ہیں۔ بیچ میں خالی بنجر زمین ہے، ریت ہے، مٹّی ہے، اور کُچھ نُچی کھُچی سی سبز

جھاڑیاں، جنھیں بھیڑیں یا اُونٹ نوچتے رہتے ہیں۔

وہ آزادی سے دونوں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر مذہب یا مُلک کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یُوں تو اُن کے مالکوں کو دیکھ کر بھی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اُن سے پُوچھ تاچھ کی جاسکتی ہے۔ اِن سے وہ بھی نہیں...!

ہمیں تین دن کی پرمیشن ملی تھی، اور خیمے لگانے کی اِجازت تھی۔ ایک اُلجھن تھی۔ لڑکے تو ضروری حاجت کے لئے اِدھر اُدھر ٹیلوں کی آڑ میں چلے جاتے تھے۔ لڑکیاں پریشان تھیں۔ ایک کچّی پکّی جگہ تو تھی۔ لیکن اُس پر کوئی دروازہ یا پردہ نہیں تھا۔

''اجی یہاں تو ریگستان ہی میں جاکے جنگل کر آتے ہیں۔ ریت سبھی کام آجاتی ہے۔ اتنا پانی یہاں کہاں ملے گا؟''

''تو نہانے دھونے اور کھانے پینے کو کہاں سے آتا ہے پانی؟''

''پائپ لائن تو ہے صاحب جی، لیکن کنٹرول تو 'جیسلمیر' میں ہے۔ یہاں آتے آتے پُورا نہیں پڑتا۔ اِس لئے پانی کے ٹینکر منگانے پڑتے ہیں۔ ٹھیکیداروں کا دھندہ پانی بھی چلتا رہتا ہے۔''

ایک خیمہ ہم نے لڑکیوں کی سہولیت کے لئے وقف کر دیا۔ پانی بوتلوں میں مل جاتا تھا، 'سلیری' کا اِسٹاک ہمارے پاس کافی تھا۔ ہماری ہیروئین نے، جنھیں ہم ڈمپی جی بُلاتے تھے، گولیاں تو کئی بار چلائی تھیں، فلموں میں۔ لیکن اصل بندوق سے، اصلی گولی کبھی نہیں چلائی تھی۔ اُنہوں نے دیوار کے کھانچے میں جُوے سپاہی سے پُوچھا۔

Scanned by CamScanner

''اِس میں گولی ہے؟''

''بالکل ہے جی!''

''دیکھوں؟''

سپاہی نیچے اُتر آیا۔ دیوار سے لگے کھوکھے پر پاؤں رکھ کے ڈمپّی جی اُوپر چڑھ گئی۔ سامنے خالی ریگستان تھا۔ زمین پر بچھا ایک نہایت خوبصورت بیڈ کوَر!

دُور دائیں طرف، دو سبز پیڑ تھے، کھجیری کے، اور اُسی کے پاس بیٹھے ہُوئے چار چھ گھر۔

''وہاں کون رہتا ہے۔ اُدھر.....'' اِشارے سے ڈمپّی جی نے پُوچھا۔

''گڈریوں کے گھر ہیں۔''

''گاؤں ہے؟''

''گاؤں ہی سمجھ لو۔''

''نام کیا ہے؟''

سپاہی نے کُچھ جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بہت سے سپاہی، ہیروئین کے پیچھے آ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب مُسکرا رہے تھے۔ اُن میں ایک سینئر بھی تھا۔ بولا:

''جی نام تو کوئی نہیں۔ سب پوچینہ کی پُونچھ کہتے ہیں۔''

کھرکھراتی سی ایک ہنسی، کسی کھرے کی لکیر کی طرح گذر گئی۔ ڈمپّی نے اُس سینئر سے پُوچھا۔

Scanned by CamScanner

''میں یہ بندوق چلا سکتی ہُوں؟''

جھک کر بولا: ''ہاں جی!..... چلا لو!''

''اور اُدھر کے بارڈر سے کسی نے چلا دی تو؟''

''کوئی نہیں جی۔ ایک گولی تو ہم لوگ سلام دُعا کرنے کے لئے چلاتے ہیں۔''

''اچھا؟۔ اور دو گولی چلائیں تو؟''

سب سپاہیوں کے مُنہ پر ایک چمکی ہُوئی ہنسی تھی۔ سینئر بولا۔

''سگنل ہے، کسی کو آنا ہے تو آنے دو۔ اُدھر سے کسی کو بھیجنا ہو تو، وہ بھی دو بار ہی چلاتے ہیں۔''

کھریے کی ایک اور لکیر کھنچتی چلی گئی۔ سب کے سب پھر ہنسے اور ہنسی وہیں چمکی رہی۔ ڈمپی جی نے ادھر کی چوکی کو ایک سلام داغ دیا۔ خالی ریگستان میں گولی کی آواز گونجی اور تیرتی ہُوئی اُس طرف چلی گئی۔ گوپی اڈوانی میرے پاس کھڑا تھا۔ اچانک کانپ گیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیا ہُوا؟'' میں نے پوچھا۔

کھسیانی سی آواز میں بولا۔'' کُچھ نہیں۔ اُس طرف سندھ ہے۔ میرا گاؤں۔''

اور باہر چلا گیا۔

گوپی کو یونٹ میں بہت سے لوگ گوپی بے بی کہہ کے چھیڑتے ہیں۔ بہت جذباتی آدمی ہے۔ ماں کی بات کرے تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ سندھ سے ہے۔ تقسیم کے بعد بھی تین چار سال وہیں اسکول میں پڑھا تھا۔ مگر ہندوستانی مہاجروں کے پہُنچنے کے بعد

Scanned by CamScanner

حالات اور خراب ہوتے گئے۔ اور انھیں بھاگنا پڑا۔ آج اچانک سندھ کو اتنا قریب دیکھ کر اُس کا جی بھر آیا۔

اُس دن وہ پھر نظر نہیں آیا۔ رات کو خیمے میں بھی نہیں تھا۔ ڈائریکٹر نے ایک بار پُوچھا بھی تو میں گول کر گیا۔ ''طبیعت ٹھیک نہیں تھی، میں نے خیمے میں آرام کرنے کے لئے کہہ دیا ہے۔''

لیکن مُجھے واقعی فکر لگ گئی تھی۔ کہیں اُس پار ہی تو نہیں چلا گیا؟ اگلی صبح بھی کہیں نہیں تھا، اُس کے بعد اگلے دن دوپہر بعد ملا مُجھے۔ پتہ چلا وہ وقعی اُس پار چل دیا تھا۔ لیکن کُچھ دُور جانے کے بعد وہ بھٹک گیا تھا۔ اُس نے بتایا۔

''ریگستان ہر طرف ایک ہی سا نظر آتا ہے۔ ایک 'ٹیلہ' چڑھو تو آگے پھر وہی لگتا ہے، جو پیچھے چھوڑ کے آئے ہیں۔ ایک ہی طریقہ تھا میں اپنے پیروں کے نشان دیکھ دیکھ کر واپس آ جاؤں۔ مُڑ کے دیکھا تو وہ بھی مٹ گئے تھے۔ میں سچ مُچ ڈر گیا تھا، خیر ہو سلمان کی اللہ نے بھیج دیا اُسے۔''

''وہ کون ہے؟''

''سُن تو۔ بتاتا ہُوں۔ جب ریگستان گرم ہونے لگا تو سچ میں ایسا لگا، ریگستان مُجھ پر ناراض ہو رہا ہے۔ کیوں میرا بچھونا خراب کرتا ہے۔ اُٹھا اپنے پیر، اور بھاگ یہاں سے۔

اتنا بڑا ہے وہ، اور میں ذرا سا۔ میں نے قمیص نکال کے سر پہ باندھ لی۔ کُچھ دیر بعد، دُور سے گانے کی آواز آئی۔ بہت دُور سے، کوئی مانڈ گا رہا تھا۔ 'پدھارو مھارے دیش!'

Scanned by CamScanner

مُجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے قمیص کھول کے لہرانی شروع کر دی۔ اُس نے پتہ نہیں کہاں سے دیکھا مُجھے، کیوں کے جب نظر آیا تو اُسی ٹیلہ پر، جس کے نیچے میں کھڑا تھا۔ وہ اُونٹ پر تھا، بولا:"

"کوتھا پیؤ انچیں سائیں؟"

کیا بتاؤں، اُس حال (صحرا) میں اُس کے مُنہ سے سندھی سُن کے لگا جیسے ماں نے گود میں اُٹھالیا۔ اُس نے پوچھا، کہاں سے آرہے ہو۔؟ "پوچینہ" میں نے بتایا۔ اُونٹ پر بٹھالیا اُس نے اور دوڑ لیا۔

"کہاں گئے تھے؟ سندھ؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں، 'میاں جلاڑھ' نام کا گاؤں ہے۔ پوچینہ کے پیچھے۔" وہیں گھر تھا سلمان کا۔

"تو وہ تھا کہاں کا؟ ادھر کا؟ یا اُدھر کا؟"

گوپی نے بتایا کے وہ اُدھر سے بھاگا ہُوا ایک خُونی ہے۔ اس طرف اپنے کسی رقیب کا خون کر کے بھاگا آیا تھا۔ اور 'میاں جلاڑھ' میں آ کے پناہ لی تھی، اور پھر، جس عورت نے پناہ دی تھی اُسے، تین سال بعد اُسی سے شادی کر لی۔ اب دو بچے ہیں اُس سے۔ بڑے ہو رہے ہیں۔

"پھر واپس نہیں گیا؟"

"جاتا ہے محبوبہ سے ملنے۔ اُسی لڑکی سے۔ اب وہ بھی شادی شُدہ ہے۔ اُس کے بھی دو بچے ہیں۔"

Scanned by CamScanner

ذرا وقفہ کے بعد، گوپی نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میں نے بتایا کے میں وہیں کا ہُوں تو فوراً بولا! چلو ابھی لے چلتا ہُوں۔ تُمہارا گاؤں دِکھا کے لے آؤں گا۔ ایک بار تو من چاہا چلا جاؤں۔ میں نے کہا، ابھی؟ رات میں؟ وہ بولا:

''ارے سائیں، ماں بھلے ہی راستہ بھُل جی ونجان، پر مینجی اُونٹنی نہیں بھُولے گی۔ سیدھی اُسی کے دروازے پر جا کے کھڑی ہو جائے گی۔

''کس کے؟'' میں نے پوچھا، تو جواب اُس کی عورت نے دیا۔

''ایک رانڈ اُدھر بھی تو ہے۔ اُس کی۔ بارڈر پار۔''

''اور تمہیں بُرا نہیں لگتا؟''

''میں تو بول چکی ہُوں، اُس کو بھی لے آ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہ لیں گی۔''

کیا کمال کے بارڈر ہیں ہمارے۔ اخباروں میں پڑھتے ہیں تو یہی لگتا ہے جیسے کوئی آگ کی لکیر کھینچی ہُوئی ہے۔ خُون کی دھار بہہ رہی ہے۔

اگلی شام کی بات ہے، ہمارے ہیرو، بنّے جی نے مُجھ سے کہا تھا۔

''یار رم نہیں چلتی۔ کسی طرح وہسکی کا انتظام کر چاہے انڈین ہی مل جائے۔''

پوچینہ کے نیچے ایک گاؤں میں سُنا تھا کہ وہاں انڈین وہسکی پاکستان کے لئے سمگل ہوتی ہے۔ اور بدلے میں اس طرف سے چاندی آتی ہے۔ دونوں طرف کی پُولس چوکیوں کی ماہواری بیٹھکیں بھی ہوتی ہیں۔ دونوں طرف کے پربندھک ملتے ہیں۔ کتنی بھیڑیں اِدھر آئیں، اور کتنے اُونٹ اُدھر پکڑے گئے۔ اُن کا حساب ہوتا ہے۔ اور ان کی

Scanned by CamScanner

آپسی، واپسی کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ آپس میں کبھی کبھی شام کی دعوت اور دارُو شارُو بھی ہو جاتی ہے۔

اُس شام بارڈر کی ایسی ہی ایک چوکی پر میں اور گوپی بیٹھے ہُوئے تھے۔ حولدار بُھارت سنگھ کے پاس۔ وائرلیس پر وہ اُونٹ کی بات ختم کر چکا تھا۔ وائرلیس پر ہی اُس نے ہمارے لئے وِہسکی کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔ اب وہ گھر سے آئی، بہُو کی چِٹھی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"اجی، مورکھ ہے، باؤلی ہو گئی ہے۔ کُچھ بھی اُٹھا کے لکھ دیوے ہے۔ اب ہم ہندوستان کی رکھشا کریں کے اُس کی دو کنال زمین کے لئے لڑیں، جو ٹھاکُر نے دبالی ہے۔ یہاں تو دیکھو نہ جی، سارے بارڈر کُھلے پڑے ہیں۔ دُشمن کسی وکھت بھی گُھس کے آ سکتا ہے۔ سرکار نے پرماݨو بم کھا لئے۔ ہمارے لئے کیا کیا۔ ماچس بھی ایک روپے کی ہو گئی۔"

اُس کی بیڑی بُجھ گئی تھی۔ ننگی چارپائی کے بان ہی میں سے ایک تنکا چھیلا اُس نے اور لالٹین کے اُوپری سوراخ سے جلا کے بیڑی تازہ کی۔ دو ایک کش لگائے کے بیڑی پھر بُجھ گئی۔ اُسی وقت گوپی نے لائٹر سے سگریٹ جلایا تو ہنس کے بولا۔

"اپنے بھی ایک لائٹر ہوتا تو زندگی میں کیا مزا ہوتا۔ اب پرماݨو بم سے بیڑی تو نہیں سُلگا سکتے نا۔ اُوور.....!"

دُمبے !!

پُنیت گڑھ، ایک چھوٹا سا دیہات ہے، اِس طرف ہندوستان میں۔ سیالکوٹ ایک بڑی جگہ ہے ___ اُس طرف! پاکستان میں!

کیپٹن شاھین، ایک ہینڈسم ریٹائرڈ فوجی ہیں، نیویورک میں! ''کشمیر'' نام سے ایک ریسٹورنٹ چلاتے ہیں۔ اُن کے دفتر کی شکل محاذ کے ایک 'بنکر' (Bunker) کی صورت ہے۔ چھت پر بھی پلاسٹک کی بنی ہری پتّیوں سے بنائی جالی لگا رکھی ہے۔ ایک طرف بہت سی ٹوپیاں ٹانگ رکھی ہیں۔ فوجی بُوٹ رکھے ہیں، ایک وردی ٹانگ رکھی ہے

امجد اسلام امجد نے مجھے دوپہر کے کھانے پر وہاں مدعو کیا تھا۔ اور وکیل انصاری آکر مجھے وہاں لے گئے تھے۔ وہ اُس طرف سے ہیں، لیکن اِس طرف کے تمام اُردو شعرا اور ادیبوں کو اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے اُردو کے شوق کو تسکین دیتے ہیں۔

جشن گوپی چند نارنگ، امریکہ میں کئی جگہوں پر منا چکے ہیں۔ اپنا ایک ہوٹل ہے

Scanned by CamScanner

اُن کا۔ وہی روزگار کا ذریعہ ہے۔ سردار جعفری، اِس طرف کے، اور احمد فراز، اُس طرف کے، اکثر اُن کے گھر پہ ٹھہرے ہیں ___ وکیل انصاری کا محبوب جُملہ ہے: ''زندگی تیتر بٹیر ہو کے رہ گئی ہے۔'' یا کبھی کبھی ''ہم لوگ تو تیتر بٹیر ہو گئے ہیں۔'' بڑا اَوریجنل (original) جُملہ ہے۔ پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ نہ اِس طرف۔ نہ اُس طرف!

کیپٹن شاھین کے ریسٹورنٹ پر مدعو کرتے ہوئے امجد بھائی نے کہا: ''نیو یورک میں اگر ایسٹرن کھانا، کھانا ہو تو اِس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں مِل سکتی۔'' جب ہندوستانی کھانا کہنا ہو یا پاکستانی، تو امجد بھائی بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اُسے پنجابی بھی نہیں، ''ایسٹرن'' کہتے ہیں۔ اور کشمیر کا تو نام بھی نہیں لیتے۔

لیکن کیپٹن شاھین، فوجیوں کی طرح بڑے دِلدار آدمی ہیں۔ ہنس کے کہتے ہیں: ''اجی کشمیر پر تو دونوں ہی اپنا حق جتاتے ہیں۔ اِس لئے ہمارا ریسٹورنٹ بہت اچھا چلتا ہے۔''

فوج سے کسی بات پر رُوٹھ کر اِستعفٰے دے دیا تھا۔ لیکن فوجی ہونے کا فخر اب بھی ساتھ ہے ___ کہتے ہیں: ''ایک مہینہ اور ٹھہر جاتا تو 'میجر' ہو کر ریٹائر ہوتا، لیکن مجھے نام کے ساتھ کیپٹن کہلوانا زیادہ اچھا لگتا تھا۔''

1971ء کی جنگ میں حِصّہ لیا تھا۔ اور بتا رہے تھے کہ اُس جنگ میں ''سارا ایکشن بنگال ہی کی طرف ہُوا تھا۔ پنجاب کی طرف چھوٹی موٹی جھڑپیں ہُوئیں۔'' اور اُسی میں وہ سیالکوٹ سیکٹر کے ایک مورچے پر ایکشن میں شامل تھے۔

اب ہلکی سی داڑھی رکھ لی ہے اور بات کرتے ہوئے مونچھوں کو بار بار سہلاتے رہتے ہیں۔ مَیں نے پُوچھا تھا کہ ''وہ کون سا جذبہ ہوتا ہے، جو آدمی کو سولجر بناتا ہے؟''

Scanned by CamScanner

''وہ جی، ایک ٹھاٹھ کی بات ہوتی ہے۔ وردی کی شان، اور رُتبے کی ٹوپی لگانا، ایک شخصیت دیتی ہے آدمی کو۔ اور اُس کے علاوہ مرنے مارنے کی کوئی تمنا نہیں ہوتی...''

اور پھر خود ہی ہنس دیئے: ''ہماری لڑائی بھی کوئی لڑائی ہے، ہندوستان پاکستان کی۔ ایویں سکول کے بچّوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔ اِس کی بانہہ مروڑ، اُس کا گھُٹنا توڑ۔ اِس کی سلیٹ توڑ دی۔ اُس کی تختی چھین لی۔ کبھی نب چبھو دی۔ کبھی سیاہی گرا دی۔ یاد ہے سکول سے بھاگ کے دُنبوں کی لڑائی دیکھنے جایا کرتے تھے؟ آپ بھی گئے ہوں گے!''

وہ بڑے ''ڈاؤن ٹو ارتھ'' انسان لگے۔ لہجے میں کمال کی ایمانداری تھی۔ میں نے کچھ پوچھا تھا۔ جس پر جواب میں کہنے لگے___

''فوجی کو بھی پہلے پہل ڈر ضرور لگتا ہے۔ لیکن دو تین گولیاں چلا لینے کے بعد، خوف و ہراس کا خیال بھی نہیں رہتا۔ جب گولی چلتی ہے تو کارتُوس کی ایک خوشبو اُڑتی ہے۔ فرنٹ پر گولیاں چلاتے ہوئے اُس کا نشہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر گولیاں نہ چلیں تو کبھی کبھی نشہ ٹوٹنے بھی لگتا ہے۔ کسی کو لگنا لگانا ضروری نہیں ہوتا!'' پھر بولے: ''آدمی خوف سے بھی مانوس ہو جائے تو خوف نہیں رہتا۔''

مجھے لگا جیسے کہہ رہے تھے، فرنٹ پر موت سے مانوس ہو جانے کی بات ہے۔ آ جائے گی جب آنا ہوگا۔ وہ بتا رہے تھے:

''شروع شروع میں جب ٹریننگ ہوتی ہے۔ اور زمین پر لیٹ کر، کہنیاں گھُٹنے چھلتے ہیں، تو کئی بار خیال آتا ہے یہ نوکری جاری رکھیں یا چھوڑ دیں___؟

لیکن جب کسی غلطی پر آپ کا 'برگیڈیئر' آپ کو چلا کر کھڑا کرتا ہے اور پُوچھتا ہے، 'کہاں کے ہو؟' ذرا زور سے بولو!' تو صاحب یقین مانیے اپنے گاؤں یا علاقے کا نام

Scanned by CamScanner

مُنہ سے نہیں نِکلتا۔ بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔''

شاید یہی بات آگے چل کر فوجی کے لئے اپنے مُلک کی عزّت بن جاتی ہے۔

کیپٹن شاھین نے بتایا: ''سچیت گڑھ ایک چھوٹا سا دیہات ہے، اُس طرف! گِنے چُنے گھروں کا۔ کچھ تو پہلے ہی خالی ہو چُکا تھا کیونکہ محاذ کے بہت قریب تھا، کچھ ہمارے پہنچنے پر خالی ہوگیا۔ ایک ایک گھر کا معائنہ کر لینا ضروری تھا۔ کیونکہ کوئی بھی علاقہ بغیر کسی مقابلے کے فتح ہو جائے تو اُس میں دشمن کی کسی چال کا شُبہ ہونے لگتا ہے۔''

کیپٹن شاھین کا کہنا یہ بھی تھا کہ، اِس طرف اور اُس طرف کے لوگوں اور فوجیوں کے مزاج میں کافی فرق ہے ___

''ہے وہی پنجاب، لیکن اِس طرف کے فوجی بھی، اور لوگ بھی aggressive ہیں، اور اُس طرف کے ذرا ٹھنڈے سبھاؤ کے لوگ ہیں۔ اُس طرف کی کھیتی باڑی اور کُنوئیں، سرحد کی لکیر تک آتے ہیں۔ ہمارے اِس طرف کے بارڈر دو تین سو گز چھوڑ کر چوکیاں بناتے ہیں، اور گھر بساتے ہیں ___ ایسی جگہوں پر یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پانچ سات سپاہیوں کے دستے گشت (Petroll) کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر اتنے پاس ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کا سگریٹ بھی جلا سکتے ہیں۔''

اِس طرف کے فوجی عموماً پنجابی ہوتے ہیں اور اُس طرف اکثر غیر پنجابی مل جاتے ہیں۔ لیکن اِس طرف والے بُلا بھی لیتے ہیں۔ 'کیوں بھئی، کہاں کے ہو؟'

''کوئی مدراسی ہو تو انگریزی میں جواب دیتا ہے، ورنہ عام طور پر اُردو نما ہندی ہی سُنائی دیتی ہے۔

Scanned by CamScanner

سچیت گڑھ فتح کرنے کے بعد میں چار پانچ سپاہیوں کو ساتھ لے کر گھروں کی تلاشی لے رہا تھا کہ ایک کوٹھری کا دروازہ دھکیلا تو سہما ہُوا ایک لڑکا کونے میں دُبکا ہُوا نظر آیا۔ سپاہیوں نے مُڑ کے مجھے آواز دی__ 'سر جی!'

مَیں آیا تو اچانک ہی وہ لڑکا لپکا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ سپاہیوں نے چھڑایا اُسے۔ اور مجھے سمجھ نہیں آیا، کیا کروں؟''

اُس کے ماں باپ کا پوچھا تو وہ کوئی جواب نہیں دے پایا۔ بہت ڈرا ہوا تھا کپکپا رہا تھا۔ مَیں نے اُسے بھاگ جانے کے لئے کہا، لیکن وہ نہیں گیا__ مَیں اُسے جیپ میں بٹھا کر پچھلی چوکی تک لے آیا۔ روٹی شوٹی دی اور ایک کونے میں بستر ڈال کے سو جانے کے لئے کہہ دیا۔ جوانوں سے کہہ دیا، کسی سے ذکر نہ کریں۔ اصولاً وہ ہمارا War Prisoner of تھا اور فرض بنتا تھا کہ ہیڈ کوارٹر میں خبر کر دوں اور دُوسرے 'پرزنرز' (Prisoners) کے ساتھ جیل میں ڈال دُوں۔

پتہ نہیں کیوں، اُس کی معصوم سی آنکھیں دیکھ کر جی نہیں چاہا، وہ اِس طرح کی آفت سے گُزرے...

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اپنے ہلّے شلّے اُتار کے اُسی بارڈر والے گاؤں پر گشت کرنے چلا گیا۔ گاؤں سے ذرا ہٹ کے ایک کھیت تھا۔ دُور 'ٹیوب ویل' پر ایک بُزرگ سردار کو مُنہ ہاتھ دھوتے دیکھا تو آواز دی__ ''سردار جی__ اَوئے ایدھر آ!''__ ہاتھ کے اشارے سے پاس بُلایا تو اپنی پگڑی کے..... شُملے سے مُنہ پونچھتا ہوا چلا آیا__ مَیں نے پوچھا__

Scanned by CamScanner

''تم گئے نہیں؟''

بڑی حیرت سے پوچھا اُس نے: ''کہاں؟''

''گاؤں چھوڑ کے چلے گئے سب۔ تم کیوں نہیں گئے؟''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کے طعنہ دیا۔

''لے! گاؤں تو اُس طرف چھوڑ کے آیا تھا۔ تیرے پاس! اب کھیت لینے آیا ہے کیا؟''

سردار غصّے بھی لگ رہا تھا۔ مَیں نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ: ''سچیت گڑھ سے سات آٹھ برس کا ایک لڑکا اِس طرف آ گیا ہے۔ اُس کے ماں باپ شاید گاؤں چھوڑ کے چلے گئے ہیں!''

''تو؟''

''اُسے لے آؤں تو اُس کے ماں باپ تک پہنچا دے گا؟''

سردار سوچ میں پڑ گیا۔ بڑی دیر بعد، اُس نے مُنڈی ہلائی: ''ٹھیک ہے۔''

مَیں نے کہا شام کو پانچ بجے آ جانا۔ مَیں لے کر آؤں گا۔''

کیپٹن شاھین نے کہا:

''پیلے پیلے دانتوں کی ایسی ہنسی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سردار نے ہنس کے کہا: ''اُسے چھوڑ دے۔ مجھے لے جا۔ میرا گاؤں اُس طرف ہے۔ سیالکوٹ کے آگے۔ چھجّرا!'' اور جھومتا ہوا واپس چلا گیا۔ گاؤں کے نام ہی سے مست ہو گیا۔''

اُس شام میں جا نہیں سکا۔ ہمارا کمانڈر دورے پر آ گیا تھا اور اُس لڑکے کو چھپا

Scanned by CamScanner

کے رکھنے میں، سمجھئے بس جان ہی نکل گئی۔ کھلا پلا کے اُسے کنٹرول رُوم کی پرچھتی پر چھپا رکھا تھا۔ جلدی سے نکالا اور پیچھے پیخانے میں چھپا دیا۔ کمانڈر جب کنٹرول رُوم میں آیا تو وہاں سے نکال کے سٹور رُوم کی بوریوں میں چھپا دیا۔ سب کی جان پر بنی تھی، کیونکہ قانوناً یہ سراسر جُرم تھا اور پتہ چل جاتا تو ہم میں سے کئی افسر سسپینڈ کئے جا سکتے تھے۔ ایک بار تو جی چاہا۔ دو سپاہیوں سے کہوں کہ ایک بوری میں ڈال کے، سردار کے کھیت میں پھینک کر آ جائیں۔ جب تک کمانڈر رہا۔ ہماری جان پر بنی رہی۔

بنگال کے ایکشن کی خبریں آ رہی تھیں۔ جو بہت مایوس کُن تھیں۔ بھارتی فوجیں مکتی باہنی کا ساتھ دے رہی تھیں اور یحییا خان... خیر... چھوڑیئے۔'' وہ اچانک چُپ ہو گئے۔

ایک وقفہ گیا، کیپٹن کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ بولے!

''اگلے دن بھی فوجی ٹکڑیوں کی بہت موومینٹ رہی۔ سارا دن نکل گیا۔ شام کا وقت تھا اور سُورج غروب ہونے والا تھا جب میں اُس لڑکے کو ساتھ لے کر بارڈر لائن پر پہنچا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ سردار میرا انتظار کر رہا تھا۔ چار پانچ سپاہیوں کی ایک ٹکڑی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اُسی میں سے ایک نے پوچھا: ''کیپٹن ہو کہ میجر؟'' فرنٹ پر ہمارے پھیتے نہیں لگے ہوتے، پھر بھی کوئی بڑا افسر ہو تو پہچانا جاتا ہے۔ وہ بھی کوئی کیپٹن میجر ہی تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے ہاتھ ملایا۔ اور لڑکا اُس کے حوالے کیا۔

'یہیں سچیت گڑھ کا ہے۔ ایک گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔'

افسر نے ذرا سختی سے پوچھا: 'کیوں رے؟ کہاں کا ہے؟ ماں باپ کون ہیں

Scanned by CamScanner

تیرے؟''

لڑکا پھر سے سہم گیا تھا۔ آنکھ اُٹھا کے میری طرف دیکھا اور بولا:

''چاچا ___ میں یہاں کا نہیں ہوں۔ اُس طرف کا ہوں۔'

اُس نے ہماری طرف اِشارہ کیا، 'سیالکوٹ کے آگے، چھجرا کا ہوں!'

سب بھونچکے رہ گئے ___

میں نے سردار کی طرف دیکھا۔ اُس کے پیلے پیلے دانت نکل آئے۔ اُس نے آگے بڑھ کے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور چھلکی ہوئی آنکھوں سے پُوچھا: ''اچھا؟ چھجرا کا ہے تُو؟''

مَیں نے ڈانٹ کے پُوچھا، ''تو یہاں کیا کر رہا تھا؟''

لڑکے کے آنسو نکل آئے، بولا:

''سکول سے بھاگ کے آیا تھا، لڑائی دیکھنے!''

کیپٹن شاھین کہہ رہے تھے!

''یقین مانیے، ہم دونوں فوجی اُس کے سامنے، دو بیوقوف ماسٹروں کی طرح کھڑے تھے۔ اور ہماری شکلیں دُمبوں جیسی لگ رہی تھیں!''

Scanned by CamScanner

اتنے سارے بازو، ٹانگیں، ہاتھ اور سر اور پاؤں
بچے کھُچے پُرزے لگتے ہیں، 'سپیئر پارٹز' ہیں!

Scanned by CamScanner

ہلسا

بھبھوتی، ٹہلتے ہُوئے، دھوتی کھونچتے، رَسوئی تک آئے اور دروازے ہی سے بولے:

"آج اخبار ہی نہیں آیا ابھی تک! لگتا ہے باگ بازار کا راستہ بھی بند ہو گیا۔"

کنچن، مچھلی میں مگن تھی۔ بولی:

"ہلسا کی آنکھیں کتنی سُندر ہوتی ہیں گو ___ جل پری لگتی ہے۔"

کنچن، بڑی پرات میں پانی ڈال کے مچھلی کو نہلا رہی تھی۔ بھبھوتی ذرا سا مُسکرائے۔ بولے:

"بہت لاڈ آرہا ہے؟ ہُوں؟ دِن موسم کا کھا جالے آیا ہے رامو۔ جانو؟"

"معنے؟"

بھبھوتی کی آنکھوں میں دانائی کی چمک دِکھائی دی۔ بولے:

"جن مہینوں میں R نہ ہو، اُن مہینوں میں مچھی نہیں کھایا کرتے۔ وَرجِت ہے!"

Scanned by CamScanner

کنچن اُنہیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر بولے:

''جیسے مئی، جُون، جُولائی، اور اگست! اب سوچ کر دیکھو جنوری سے دسمبر تک۔ باقی سب مہینوں میں R لگتا ہے!''

کنچن نے، من ہی من حساب لگایا، اور ہاتھ تھوڑی پر آ گیا۔

''ماگو___ اچھا، کیوں نہیں کھاتے اِن مہینوں میں؟''

بھبھوتی نے روائیتی بنگالی شوہر کی طرح، نسوار کی چٹکی کھینچی، اور دھوتی سنبھالتے ہُوئے، رسوئی کی دہلیز پر ہی بیٹھ گئے۔

''مئی سے اگست تک مچھیوں کی 'بریڈنگ بیریئڈ (Breeding Period) ہوتا ہے۔ اُن دِنوں میں گربھوتی ہوتی ہیں مچھیاں۔ جس طرح پتنی گربھوتی ہو تو شوہر اُن دنوں میں.....''

''دھت! کی شوب بو کچھو___!''

ہاتھ سے دھکیل کے، کنچن نے بھبھوتی کو اُٹھا دیا رسوئی سے۔

''! اتنے بڑے ہو گئے، ابھی تک دُشٹمئی نہیں گئی___!''

ہنستے ہُوئے، بھبھوتی پھر اندر چلے گئے۔ جا کے اپنا ٹی۔ وی آن کر دیا۔ خبریں آ رہی تھیں۔ دنگوں کی۔ جگہ جگہ مارکاٹ چل رہی تھی۔ بازار بند ہو گئے تھے۔ شہر میں کئی جگہ کرفیو لگ گیا تھا۔

''شاید اسی لئے!'' وہ بڑبڑائے۔ ''مچھیاں بازار تک پہنچیں نہیں۔ اور رامو کو گھاٹ پر سستے میں مِل گئی۔''

یہ ایک اور عقل کی بات بتانے رسوئی تک گئے تو کنچن پیچھے کے نل پر نہانے چلی

Scanned by CamScanner

گئی تھی۔ رَسوئی پار کر کے، بھبھوتی وہاں تک پہنچ گئے۔ ساڑھی تار پہ ڈال کے، کنچن نے پردہ کر لیا تھا۔

''شُنچو___''

''ہیں! بولو___؟'' پانی میں ڈوبی ہُوئی آواز آئی۔

''یہ رامُو جو ہے ناں___ وہ صُبح گھاٹ پر گیا ہوگا۔ اور....'' کہتے کہتے اُنہوں نے تھوڑا سا پردہ اُٹھا دیا۔

''دھت!'' لوٹا بھر کے پانی اُن کے مُنہ پر پڑا۔ ''ہٹو یہاں سے۔ شُکر کرتی ہُوں، صُبح صُبح دفتر جاتے ہو تو___'' بھبھوتی ہنس کے اُسی کی لٹکی ساڑھی سے مُنہ پونچھ رہے تھے۔

''ابھی تک اخبار بھی نہیں آیا، تو بیکاری میں کیا کرے آدمی میں مچھی صاف کر دوں؟''

''ہرگز نہیں! ہاتھ مت لگانا اُسے!'' کنچن نے ڈانٹ کے منع کر دیا۔

بھبھوتی سارے گھر میں اُوپر سے نیچے، نیچے سے اُوپر تک ٹہلتے رہے۔ ٹی۔ وی پر بھی اور کوئی پروگرام نہیں تھا۔ 'چتر گیت' کے بعد خبریں۔ خبروں کے بعد پھر آدھا گھنٹہ 'چتر گیت'۔ بلیک اینڈ وہائیٹ ٹی۔ وی میں گانوں کا مزا بھی نہیں آتا۔ کلر کے زمانے میں یہ بلیک اینڈ وہائیٹ، ٹی۔ وی! ہیروئن کے کپڑے اور گولھے ایک ہی رنگ کے۔ پیٹ اور بلاؤز میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کیا بات ہُوئی؟

ایک بار پھر، گھر میں رامُو کی آواز آئی۔ پتہ ہی نہیں چلتا، وہ کب آتا ہے گھر میں، کب نکل جاتا ہے۔ سارے محلّے کا کام کرتا ہے۔ وہ غُسلخانے کے باہر کھڑا پُوچھ رہا تھا:

''بوؤماں، ماچھ کا مسالہ پیس دوں؟ رائی دے کے بنے گی تو؟'' کنچن کی آواز

Scanned by CamScanner

آئی تھی۔

''مسالہ ٹنٹنی کی مکسی میں پسوا کے لے آ۔ میں آتی ہوں۔'' ٹنٹنی، پڑوسیوں کی چھوٹی لڑکی کا نام تھا۔ رامو پھر نکل گیا۔

بھبھوتی کو اچھا نہیں لگا۔ رامو اُن کی پتنی سے باتیں کرے، وہیں کھڑے ہوئے، جب وہ نہا رہی ہو۔

ٹی۔وی میں بہت ڈسٹربینس (disturbence) تھی۔ بند کر کے آرام کرسی پر پسر گئے۔

پوجا گھر میں گھنٹی بجنی شروع ہوئی تو سمجھ آ گیا کہ کنچن نہا کر لوٹ چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں پرشاد ملے گا۔ کنچن ہاتھ پر نہیں دے گی۔ کہے گی! ''ہاتھ دھو کر آؤ۔'' وہ مُنہ کھول دیں گے۔ اور کنچن، پرشاد مُنہ میں ٹپکا دے گی۔ وہی ہُوا۔ کنچن نے آتے ہی پوچھا۔

''نہائے نہیں ابھی تک؟''

''اُوں ہُوں ___'' مُنڈی ہلا کے، مُنہ کھول دیا بھبھوتی نے۔ پرشاد مُنہ میں ڈالتے ہُوئے کنچن کے گیلے گیلے بال اُن کے چہرے پر آ پڑے بال ہٹاتے ہُوئے، بھبھوتی نے کنچن کے گال پر چٹکی لے لی۔

''اُف! سمئے، اسمئے کچھ نہیں ہوتا ناں تُم لوگوں کے لئے؟''

''تُمہاری سُندرتا سراہنے کے لئے، سمئے تھوڑا ہی نشچت کرنا پڑتا ہے۔''

''متھے شوب!''

جھوٹ ہی سہی۔ پرجاتے ہُوئے کنچن تھوڑی سی اِٹھلائی تو ضرور!

Scanned by CamScanner

بھبھوتی پھر خالی ہو گئے۔ تھوڑی دیر اُوپر نیچے ٹہلتے رہے۔ کُچھ دیر کے لئے کھڑکی پر جا کر کھڑے ہو گئے، اور پڑوسیوں کے گھر میں جھانکتے رہے۔ ایک کوّا کہیں سے گوشت کا کوئی ٹکڑا چُونچ میں اُٹھائے، بیچ کی دیوار پہ آ کے بیٹھ گیا تھا۔ ایک دُوسرا کوا آ کر پاس بیٹھا تو وہ اُڑ گیا۔ دونوں اُڑ گئے۔

بھبھوتی گھوم گھما کے، پھر وہیں آ رہے، کچن میں! مچھی پرات کے پانی میں پڑی تھی۔ مُنہ تھوڑا سا کھُلا ہُوا تھا۔ جیسے کُچھ بول رہی ہو۔ اور آنکھیں کھُلی تھیں۔ سچ مُچ خُوبصورت تھیں آنکھیں۔

کنچن نے 'داؤ' (مچھی کاٹنے کی کٹاری) کھینچ کے پاؤں کے تلے دَبا لیا۔ مچھی نکالی پرات سے۔ اُس کے چکنے بدن پر ہاتھ پھرا کے پانی صاف کیا۔ اور گچ سے تین حِصّوں میں کاٹ دیا۔ پہلے مُنڈی کاٹی۔ پھر دُوم کا حصّہ الگ کیا۔ اور پھر پیٹ چیر کے کھول دِیا۔ پرات کا پانی لال ہو گیا۔

''ٹھیک ہی کہا تھا آپ نے! گربھ وتی تھی۔ دیکھو، کِتنے انڈے نکلے ہیں!''

بھبھوتی مُسکرائے چشمہ صاف کرتے ہُوئے بولے:

''دیری لکی! الگ سے فرائی کر لینا۔ مچھی کے انڈے تو 'ڈیلیکیسی' (delicacy) ہوتی ہے۔''

اُسی وقت باہر کی گھنٹی بجی اور آواز سُنائی دی۔

''کاگذ بابُو.....وَ!''

اخبار والا، دروازے کے نیچے سے پیپر ڈال کے آواز لگا گیا تھا۔

بھبھوتی اُٹھ کر اخبار اُٹھا لائے۔ فرنٹ پیج، شہر کے دنگوں سے بھرا ہُوا تھا۔ کُچھ

Scanned by CamScanner

تصویریں تھیں۔ ایک حاملہ لڑکی کی تصویر تھی، جسے 'گینگ ریپ' کیا گیا تھا۔ اور جو بلیڈ (bleed) کرتے کرتے مر گئی تھی۔ مُنہ تھوڑا سا کھُلا ہُوا تھا۔ جیسے کُچھ بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور آنکھیں کھُلی تھیں!

اُس کی آنکھیں پرات میں پڑی 'ہلسا' سے کتنی ملتی تھیں!!

Scanned by CamScanner

دی سٹون ایج

بم گرا تو دُور تھا، لیکن گھر کی دیواریں اُس دھماکے کی تاب نہ لاسکیں۔ مٹی کی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ڈھیر ہوگئیں۔ اُسی میں اُس کی چھوٹی بہن دب کے مَر گئی۔ بڑی آپا اُسے اُٹھا کر بے نقاب دوڑ لی۔ گلی کے دُھوئیں نے پردہ کر رکھا تھا، باپ نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور ایک پوٹلی، صندوق جو ہر وقت تیار رہتے تھے، اُٹھا کے بھاگ لئے۔

تب اُس کی عُمر چار برس کی تھی۔

''ابو.... اِدھر.... اُدھر گورا ہے!''

وہ آپا کی بغل سے کُود گیا۔ اُس کی آنکھیں بڑی تیز تھیں۔ سامنے کی سڑک سے ایک جیپ گولیاں برساتی ہُوئی گذر گئی۔

''نصیر نے بچالیا!'' بہن نے بہت چُوما۔ ماں نے بہت بلائیں لیں۔

نصیر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ جیسی چیتے کی آنکھوں میں ہوتی

Scanned by CamScanner

ہے۔نصیر اب اِس جنگل کی زندگی کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔اب تو گھر کی پہچان بھی گُم ہونے لگی تھی۔ دو دو تین تین مہینے گھر سے باہر رہنا، پھر لوٹ آنا۔ گھڑے مٹکے، ڈبّے بوریاں سنبھالنا اور کُچھ ماہ بعد پھر سے بھاگ لینا۔ایک دادی تھی۔بس بھُوسے کی گٹھری کی طرح پڑی رہتی تھی۔

وہ دو برس کا تھا جب پہلی بار اُس نے ہوائی جہازوں کی گرج اور بموں کے دھماکے سُنے تھے۔ سارا گھر ہل رہا تھا اور وہ ماں کے سینے سے لپٹا ہُوا کانپ رہا تھا۔امّاں نے ایک چوڑے پٹّے سے اُسے اپنی چھاتیوں پر باندھ رکھا تھا۔ایک ہاتھ میں گٹھری تھی اور دُوسرے میں بانو، اُس کی چھوٹی بہن۔ باپ نے ایک صندوقچی بغل میں دبا رکھی تھی۔ مُنہ ہی مُنہ میں کُچھ پڑھ رہا تھا۔اپنی امّاں کو گھسیٹتے ہُوئے وہ دروازے پر لے گیا۔اور بولا۔

''امّاں، کوشش کر۔اللہ کی اُنگلی پکڑ اور چل مسید (مسجد) میں چلتے ہیں۔''

دادی بھی پتہ نہیں کِسے کوس رہی تھی۔ اُس کے باپ کو، یا اللہ میاں کو۔نصیر کی آنکھیں تب بھی چمک رہی تھیں۔ اُس نے آسمان سے ستارے گرتے دیکھے تھے۔ اور زمین پر سُورج پھٹ رہے تھے۔ایک معصوم سا خیال اُس کے ذہن سے تب بھی گذرا تھا۔

''اللہ اتنا دہشت ناک کیوں ہے؟.....ڈراتا کیوں ہے؟''

دو سال کی عُمر بہت کم ہوتی ہے لیکن آنکھیں اُس عُمر میں بھی بہت زیادہ نگل جاتی ہیں۔اور جمع کر لیتی ہیں۔اُس غذا کو، بعد میں جُگالی کرنے کے لئے، اُونٹوں کی طرح!

Scanned by CamScanner

مسجد خُون کی بُو سے بھری ہُوئی تھی۔ زخمی ہاتھ کُہنیاں، کندھے، گردن! پُورے سالم آدمی بہت کم تھے۔ نصیر کے لئے دُنیا کی نارمل صورت یہی تھی۔ اسی میں آنکھ کھولی تھی۔ اِسی میں بڑا ہو رہا تھا۔ زمین پر خُون دیکھ کر اُس میں پیر مارنا اُس کے لئے ایسا ہی تھا، جیسے بارش کے پانی میں پیر پٹخنا۔

مسجد میں نئے نئے نام بہت پڑے کانوں میں۔ اپنے قبیلے کے ناموں سے تو وہ مانوس تھا۔ لیکن رُوسی، امریکی، بُش، ترگنوف، گرگنوف، فرنگی، کوپٹر، ہیلی کوپٹر ..... لگتا تھا کسی دُوسرے قبیلے کے نام ہیں۔ کسی اور جنگل کے۔ اُن پہاڑوں کے پیچھے ہوں گے وہ جنگل، جہاں سے وہ سب کوپٹر اُڑا کرتے ہیں۔ جہاں سے آگ کے گولے آتے ہیں۔ اُن کے گھر توڑنے کے لئے۔ اپنی بالشت بھر بہن کی موت کو وہ بھُولا نہیں تھا۔

''گھر گر پڑتے ہیں ناں ابّو!.... پھر ہم گھر میں کیوں رہتے ہیں؟''

وہ تین سال کا تھا۔ جب اُس نے سوال کیا تھا۔ اُن دنوں میں وہ پکّے گھروں والے شہر میں آ گئے تھے۔

''باہر آگ برستی ہے نا بیٹا، بم جو گرتے ہیں۔'' باپ نے کہا تھا۔

''کون گراتا ہے؟''

''وہ.... گورے، جو ہیلی کوپٹر میں آتے ہیں۔''

''بم کیوں گراتے ہیں؟''

''ہمارے دُشمن ہیں ناں!''

Scanned by CamScanner

''ہم بھی اُن کے دُشمن ہیں؟''

''اور کیا؟''

اُس کے ڈیڑھ سال بعد اُس نے سوال کیا تھا۔

''تو ہم بھی اُن کے پہاڑ پر بم گرا سکتے ہیں؟''

''ہمارے پاس ہیلی کوپٹر نہیں ہیں ناں بیٹا۔''

''تو بم کیسے گرائیں گے؟''

''فدائین ہیں ناں! اسی لئے تو فدائین بھیجتے ہیں۔''

اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ املا مُشکل ہوتی جا رہی تھی..... فدائین! ایک اور لفظ اُس نے اپنی گُلک میں جمع کر لیا۔ بڑا ہو کے خرچ کرے گا۔ وہ چُپ تو ہو جاتا۔ اُس کی تسلی نہ ہوتی ان جوابوں سے۔ لیکن مکھیوں کی طرح سوال اُس کے چہرے پر بھنبھناتے رہتے۔ وہ باہر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنی غُلیل بنانے لگتا۔

دادی بہت یاد آتی تھی اُسے۔ چند مہینے جو قندھار کی ''آبنوسی'' مسجد میں کٹے تھے، اُس میں دادی نے بہت کہانیاں سُنائی تھیں اُسے۔

''دیو قامت عیار نے پری کو لے جا کر دو فلک بوس میناروں میں بند کر دیا۔ ایک مینار میں پری رہتی تھی۔ ایک میں خود رہتا تھا۔ اُس نے پری کے پنکھ کاٹ دیئے، تا کہ اُڑ بھی نہ سکے۔ مینار اتنے اُونچے تھے کہ دنیا کا کوئی آدمی اُوپر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نیچے جب خلقت شور کرتی وہ پنکھ کا ایک پر اُتار کے اُڑا دیتا۔ خلقت اُسے لُوٹنے کے لئے ہزاروں میلوں تک دوڑتی چلی جاتی۔''

Scanned by CamScanner

''شہزادہ بھی؟'' اُس نے پُوچھا تھا۔

''وہ وہیں تھا لیکن شہزادہ کیا کر سکتا تھا؟ نہ اُوپر چڑھ سکتا تھا۔ نہ اُڑ کے....''

اچانک گُلّک سے ایک سکّہ باہر آ گیا۔ ''فدائین'' وہ اپنے آپ سے بولا۔

''فدائین کو کیوں نہیں بھیجا؟''

اُسے فدائین کا مطلب سمجھ آ گیا۔ دادی ہوتی تو اُسے بتاتا۔ اُس نے ابّا سے پُوچھا، تو ابّا نے کہا۔

''وہ اللہ کو پیاری ہو گئی..... وہ لے گئے اُسے۔''

''دادی کو بھی؟'' وہ پھر سے چُپ ہو گیا۔

پتہ نہیں مسجد کے مینار چھوٹے ہو رہے تھے یا اُس کا قد بڑا ہو رہا تھا۔ دادی کی گٹھری سے نکل کے وہ مینار کی سیڑھیاں چڑھ جاتا تھا۔ بوری سے نکلے چوہے کی طرح۔ وہاں سے پُورا شہر نظر آتا تھا۔ اُوپر سے پُورا شہر اینٹوں کا بھٹہ لگتا تھا۔ جگہ جگہ سے دُھواں اُٹھتا رہتا تھا۔ نانبائی کی دُکانیں ہوں گی۔ گوشت پک رہا ہوگا۔ کباب بھُن رہے ہوں گے۔

نصیر بڑی جلدی جلدی بڑا ہو رہا تھا۔ بار بار کپڑے تنگ ہونے لگتے تھے۔ دادی پتہ نہیں کہاں سے، کس کے کپڑے اُتار کے لے آتی تھی۔ اُسی مینار سے اُس نے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سُنی تھی۔ جب وہ بازار سے گذرتے تھے تو ساری زمین ہل جاتی تھی۔ دادی کی طلسمی کہانیوں میں جو آہنی گینڈے چلتے تھے، وہی ہوں گے۔ تھوتھنی اُوپر اُٹھائے، آگ

Scanned by CamScanner

اُگلنے کے لئے۔

پھر ایک اور حملہ ہُوا۔ مسجد کو گینڈوں نے گھیر لیا۔ اور کئی دن تک گھیرے رکھا۔ روز تہ خانے کے دروازے سے کچھ لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رات کے اندھیرے میں باہر نکال دیا جاتا۔ چوپایوں کی طرح، کہنیوں اور گھٹنوں پر رینگتے رینگتے، لوگ گلی سے گذر کے میدان پار کر جاتے۔ آپا اور امّی کے ساتھ نصیر بھی نکل گیا۔ ابا اور دادی وہیں رہ گئے۔

پہاڑی کے پیچھے ایک اور گاؤں تھا، کچے مکانوں کا۔ ایک طبیلے میں کچھ خاندانوں کو پناہ مل گئی۔ یہاں گولوں کا شور کم سُنائی دیتا تھا۔ ابا بیچ بیچ میں آ کر لوٹ جاتے تھے۔ ایک بار ابا کئی دن تک نہیں لوٹے۔ امّی بار بار سجدے میں گر جاتی۔ دُعائیں مانگتی۔ اُس کی آنکھیں ہر وقت پانی سے بھری رہتیں۔ نصیر نے فرش پر لیٹے لیٹے اُن سے پُوچھا۔

''کیا دُعا مانگ رہی تھی امّی؟''

''اللہ سے تیرے ابا کی خیریت مانگ رہی تھی بیٹا۔''

نصیر لیٹا رہا۔ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بڑے دھیرے سے پُوچھا۔

''امّی، اللہ کس کی طرف ہے؟ ہماری طرف؟ کہ اُن کی طرف؟''

پھر مُڑ کر دیکھا۔ امّی جا چکی تھی۔

ایک رات نصیر نے اپنی غلیل سلوار میں اڑسی، اور اندھیرے میں رستہ سُونگھتا ہُوا اُسی تہ خانے کے راستے سے مسجد میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا

Scanned by CamScanner

اُس نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ مسجد اندر سے تہس نہس ہو چکی تھی۔ ملبے سے بھری ہُوئی تھی اور ایک سڑاند تھی۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو کُچھ لاشوں کے ہاتھ پاؤں ملبے کے نیچے نظر آئے۔ مینار کا راستہ ملبے سے اٹا ہوا تھا۔ صبح ہُوئی۔ وہ اُٹھ کر صدر دروازے کی طرف بڑھا تو کُچھ لوگ نظر آئے۔ ناک مُنہ صافوں میں لپیٹے ہُوئے۔ ہاتھوں میں پھاوڑے تھے۔ شاید ملبہ اُٹھانے والے لوگ تھے۔ چھپتا چھپاتا نصیر باہر نکل گیا۔ لیکن باہر ایک مجمع لوگوں کا دیکھ کر، وہ دیوار سے لگے ٹرک کے اندر گھس گیا۔

آدھی پونی، کٹی سڑی لاشوں کے ڈھیر ٹرک میں گرنے لگے۔ اور نصیر ایک کونے میں دُبکا، اُن کے نیچے پڑا رہا۔ قصائی کی دُکان پر ایسے ہی ادھ کٹے، ادھ چھلے بکروں کے ڈھیر آیا کرتے تھے ٹھیلے میں لد کر۔ وہ پڑا رہا۔ ٹرک چل دیا۔ پتہ نہیں کس قصائی کی ہٹی پر جا کر پھینکے گا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں پتہ نہیں نصیر کو غشی آ گئی یا وہ سو گیا۔ لیکن ایک پہاڑی کے دہانے میں جب ٹرک نے اپنا سامان اُلٹا تو وہ اُسی کے ساتھ گرا اور آنکھ کھُل گئی۔ ایک بہت بڑے گڈھے کے پاس، ٹرک سامان پھینک کر لوٹ گیا۔ نصیر رینگتا ہوا اُس انسانی ملبے کے نیچے سے نکلا۔ اُوپر ننگا پتھریلا پہاڑ تھا، جس میں چھچھوندروں کے بلوں جیسے غاروں کے مُنہ کھُلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پیروں پر ڈری لومڑی کی طرح وہ جلدی جلدی اوپر چڑھ گیا۔ ایک غار جیسے شگاف میں پناہ لی۔

اُوپر سے ملبہ نظر آتا تھا۔ شام تک گڈھا بھر کے بند کر دیا گیا۔ نصیر وہ رات بھی وہیں رہا۔ رات کے اندھیرے میں کُچھ انسانی آوازیں بھی سرسراتی ہُوئی سُنائی دیں۔ شاید آس پاس کی غاروں میں کُچھ لوگ رہتے تھے۔ بہت سی آنکھیں کودتی نظر آئیں، جنگلی خرگوش تھے شاید۔ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے نصیر نے کُچھ پتھر جمع کر کے رکھ لئے۔ غلیل

Scanned by CamScanner

ابھی تک اُس کی سلوار میں اڑسی ہوئی تھی۔ اُس نے باہر نکال لی۔ ایک نوکیلا پتھر ٹٹول کر اُسے بڑے پتھر پہ گھسنے لگ گیا۔ دادی یاد آ گئی۔

''شروع شروع میں انسان نے پتھروں کے ہتھیار بنائے۔ وہ شکار کرتے تھے اور غاروں میں رہتے تھے۔ جن قبیلوں کے پاس آگ تھی۔ وہ افضل مانے جاتے تھے۔ وہ میدانوں میں رہتے تھے۔ سفر کرتے تھے اور جگہ جگہ جا کر زمینیں فتح کیا کرتے تھے.....''

نصیر بڑے پتھر پہ گھس کر، ایک نوکیلے پتھر کا ہتھیار تیار کر رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

تلاش

پُورا سوٹ کیس کھلوایا دہلی ایئر پورٹ پر۔ کپڑے اُوپر نیچے کر کے دیکھنا تو سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن مرد سپاہی جب 'براز' اُٹھا کر جھاڑتے تھے اور واپس رکھتے تھے تو بدن میں ایک سنسنی دوڑ جاتی تھی۔ 'براز' کے اندر چھپا کر کون سے گرینیڈس (grandes) لے جاتی میں! تین چار لپ سٹک اُٹھا کر جب غور سے دیکھنے لگے تو میں نے کہا!

''یہ بُلیٹ (bullet) نہیں ہیں۔ لپ سٹک ہیں۔ رکھ لیجئے۔ رائفل میں چلتی ہوں تو چلا لیجئے گا۔''

بے شرم، بڑے پیلے دانت نکال کر بولا۔ ''دو نالی کے زمانے گئے میم صاحب، اب تو سَو سَو کے کارٹیج آتے ہیں۔''

اُس کی ساتھی لیڈی پولیس کو شاید میرا لہجہ سمجھ میں آگیا تھا۔ بولی۔ ''سرینگر کی فلائٹ میں کچھ زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے میڈم۔ آیئے۔ اِدھر آجایئے۔'' اور باڈی

Scanned by CamScanner

سرچ کے لئے وہ پردے لگے اَدھ کھلے بوکس میں لے گئی۔

میں کشمیر جارہی تھی۔ اپنے رُوٹس تلاش کرنے۔ اپنی جڑیں! حالانکہ میں کشمیری نہیں ہُوں۔

اتنا پتہ تھا مُجھے کہ میرے ماں پاپ شادی کے بعد ہنی مُون کے لئے کشمیر گئے۔ اور جب لوٹے تو میں ''کنسیو'' (conceive) ہوچکی تھی۔ میرا جنم.... شُروع ہوچُکا تھا۔

''جہلم کے برفاب پانی میں تیرتے ہوئے ایک بوٹ ہاؤس میں، اخروٹ کی لکڑی کے منقش پلنگ پر، جب دو مُقدّس رُوحیں ایک مُقدّس لمحے کو جنم دے رہی تھیں....''

ماں بڑے مزے لے کر، بڑے شاعرانہ انداز میں اپنی ڈائری سے مُجھے کشمیر کی داستانیں سُنایا کرتی تھیں۔ کشمیر میں اپنی اور پاپا کی کہانیاں! کہتیں۔

''گھوڑے پر چڑھنا تو آتا نہیں تھا۔ ٹیبل لگا کر، گھوڑے کو پاس لا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ پاپا پہلے ٹیبل پر چڑھتے، سائیس گھوڑے کو دھکیل کے ٹیبل کے ساتھ لگا دیتا، اور پاپا گھوڑے پر سوار ہو جاتے... پھر بھی دس میں سے پانچ بار گر ہی جاتے تھے۔...''

چہرے سے اخبار ہٹا کر، پاپا ٹوک دیتے۔ ''جھوٹ مت بولو۔ صرف ایک ہی بار گرا تھا۔''

''اور وہ جو آپ کی پتلون شریف پھٹ گئی تھی...'' ماں لکھنؤ سے تھیں اور پاپا کولکاتا سے۔

''وہ تو ٹیبل گر گیا تھا۔ میں تھوڑا ہی گرا۔''

''اور جو سائیس کے اُوپر چڑھ گئے تھے؟''

Scanned by CamScanner

''گھوڑا ہی بھاگ گیا۔ میں کیا کرتا؟....اچھا اب چُوپ کرو۔ جب شونالی کو لے کر جاؤں تو دِکھاؤں گا اُس کو۔''

ماں ایک لمبی سانس لے کر چُپ ہو جاتی۔

''اب کیا جاؤ گے کشمیر؟ وہی دن تھے، جو ہر سال چلے جاتے تھے۔ اب تو گولیاں چھوٹتی ہیں۔ اب کلیاں نہیں پھوٹتی، وہاں سر پھوٹتے ہیں دن رات...''

یہ اکیاسی بیاسی کی بات ہے۔ یا بیاسی تراسی کی ہوگی، جب میں سکول میں پڑھ رہی تھی۔ خبریں سُنتی تو مجھے غُصہ آتا۔ یہ پاکستانی ہوتے کون ہیں میرا کشمیر ہتیانے والے۔ کشمیر جیسے میری کوئی پرسنل ملکیت تھی۔

پھر کسی دن ماں بتاتیں:

''ہمارا ایک کشمیری نوکر تھا۔ لڑکا سا ہی تھا۔ ہم جب بھی جاتے، اُسے رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مہینے کے لئے۔ وزیر انام تھا۔ وزیر علی۔ کبھی بوٹ ہاؤس میں رُکتے تھے تو کبھی اَوبروَے ہوٹل میں۔ اوبروَے میں ہمیشہ اُس کی 'انیکسی' میں ہی ٹھہرتے تھے۔ جہاں سامنے کے لان میں دو چنار تھے۔ بڑے اُونچے، تندرست، بھرے ہوئے، بُلند قد کے۔ مجھے ہمیشہ بادشاہ اور بیگم لگتے تھے۔ ہاتھ سینے پر باندھے، ڈل لیک کا نظارہ کرتے تھے، اور ہم سب خادموں کی طرح لان میں پڑے رہتے تھے۔ دونوں بڑے خوددار تھے۔ ایک جہانگیر، ایک نُور جہاں!''

ماں سچ مُچ شاعر ہی تھیں۔ مگر صرف ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ میں نے یاد دِلایا: ''آپ وزیرا کا کُچھ بتانے لگی تھیں۔''

Scanned by CamScanner

''ہاں تو شام کے وقت وہ تُمہیں گھُمانے لے جایا کرتا تھا۔ پرام میں بٹھا کے۔ ایک روز بہت دیر ہوگئی، تو ہمیں فکر لگ گئی۔ یہ تُمہیں ڈھونڈنے نکلے۔''

''یہ کون...؟''

''تُمہارے پاپا۔ اِرون بینر جی! اُنہیں بھی بہت دیر لگ گئی۔ اور جب لوٹے تو ایک ٹیکسی میں، تُم تھیں، پرام تھی، وہ تھے، مطلب تُمہارے پاپا اور ایک دُوسرا ہی کوئی کشمیری تھا۔ وزیرا نہیں تھا۔ میں نے پوچھا: وزیرا کہاں ہے تو مُنہ سُوجا ہوا تھا۔ تُمہیں میری گود میں ڈالا، پرام اُٹھا کر برامدے میں پھینکی اور ساتھ آئے اُس کشمیری کو آواز دی.... 'مورتی لال' : نکال کے پچاس روپے دیئے اُسے۔ بہت بڑبولا تھا وہ۔ کہنے لگا۔

''صاحب اتنی سی بچّی کو آپ نے کیسے اُس کے حوالے کر دیا۔ گھر نہ جاتا، کہیں اور لے کے بھاگ جاتا تو...'' اِنہوں نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے دفع ہونے کے لئے کہا، اور وہ چُپ چاپ چلا گیا۔

''میری قیمت کُل پچاس روپے؟'' میں نے ایویں ہی بیچ میں پوچھ لیا۔

''پچاس بھی بہت ہوتے تھے اُس زمانے میں۔''

مُجھے اپنی فکر تھی کہ مُجھے کہاں لے گیا تھا وہ....

''تُمہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ اپنی نانی کو ملانے۔ یتیم تھا۔ ماں باپ ایک برفانی ''ایوالانچ'' میں دب کے مر گئے تھے۔ اور لاش بھی نہیں ملی تھی۔ وزیرے کو ہوٹل میں کئی کئی دن نائٹ ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی، اِس لئے نانی جب کوستی تو کہہ دیتا کہ اُس نے شادی کر رکھی ہے اور اُس سے ایک بچّی بھی ہے۔ اور نانی کے گرم مزاج کی وجہ سے اُسے گھر نہیں لاتا۔''

من ہی من مُجھے وزیرا بہت اچھا لگا۔ کہانیوں کے ہیرو جیسا۔ اور اُس کی کہانی

Scanned by CamScanner

بھی ایک پَری کی کہانی جیسی لگی۔ اب بھی لگتا ہے۔ پَری کہانیاں سب کشمیر ہی میں پیدا ہوتی ہوں گی اور جب برف پڑتی ہے تو نیچے اُتر آتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر وہ سچ مُچ ہی مُجھے لے کر بھاگ گیا ہوتا تو میں کشمیر ہی میں پلی ہوتی۔ لیکن کہانی میں ماں باپ سے بچھڑنا مُجھے پسند نہیں آیا.... میں نے پوچھا۔

''وزیرا، پھر نہیں آیا؟''

''آیا۔ بہت معافیاں مانگیں۔ ہم نے پھر رکھ لیا۔ لیکن پھر اُس کے ساتھ گھومنے کبھی نہیں بھیجا۔''

گھر میں ایک البم بھی تھی۔ پُرانی تصویروں کی۔ وزیرا اُن میں کہیں نہیں تھا۔ لیکن گلمرگ، یُز مرگ، پہلگام، چندن واڑی میں کھینچی ہوئی میری بچپن کی تصویریں، مُجھے کسی پری کہانی کی السٹریشن (illustration) لگتی تھیں۔

کالج میں تھی، جب ماں سے پوچھا تھا میں نے۔

''میں کشمیر دیکھ کر آؤں اِن چھٹیوں میں؟''

''خبریں نہیں پڑھتی؟ دیکھتی نہیں ٹی وی پر۔ کیا قہر مچا رکھا ہے کشمیریوں نے؟''

میں کالج ہی میں تھی۔ کوئی کرکٹ میچ تھا اور کشمیری نوجوان لڑکے ہندوستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ بہت سے سِکھ بھی شامل تھے اُن میں۔

پھر ایک اور واقعہ ہُوا اُن دِنوں میں۔ ٹیررِسٹ ایک منسٹر کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے۔ میں کہنے ہی والی تھی کہ ''نانی کو دِکھانے لے گئے ہوں گے۔'' مگر پاپا کا غُصّہ دیکھ کر چُپ ہوگئی۔ پاپا کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ اچانک مُڑ کے گرجے.... ''سمجھوتے کیے جا رہے ہیں۔ پکڑے ہوئے ٹیررِسٹوں کو چھوڑا جا رہا ہے! کِسی عام شہری کی بیٹی

Scanned by CamScanner

ہوتی تو کیا ہوتا ؟ کسی کے کان پر جُوں بھی نہ رینگتی۔ بیان ہوتے۔ ڈسٹربڈ (disturbed)وقتوں میں ہوتا ہے یہ سب! تقسیم کے دِنوں میں کیا نہیں ہُوا تھا؟''

ماں نے پوچھا: ''تو پاکستان کے ساتھ کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔ وہی تو یہ سب کروا رہا ہے۔''

پہلی بار پاپا کے مُنہ سے سُنا۔''اپنے لوگ بھی کم نہیں ہیں۔حکومت (طاقت) میں رہنے کے لئے،دونوں ہی بیچاری بھیڑوں کی کھال اُتارتے رہتے ہیں۔''

مُجھے بُرا لگا۔ پتہ نہیں کیوں، مُجھے کشمیر بہت اپنا لگتا تھا۔ نہ پاپا وہاں سے تھے نہ ماں۔ پھر بھی...!

اُنہیں دنوں پاپا کے آفس میں ایک روز دیکھا، ایک خوبصورت کشمیری نوجوان نوکری مانگنے کے لئے آیا تھا۔ پاپا نے پوچھا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

بیچارا بڑی دبی سی آواز میں بولا: ''کشمیر سے، کشمیری ہُوں سر۔لیکن دنگئی نہیں ہُوں۔ٹیررِسٹ نہیں ہُوں میں!''

پاپا نے بڑی نرمی سے ٹال دیا۔ ''اس وقت تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر کبھی پتہ کر لینا۔''

میں جانتی تھی وہ جھوٹ ہے۔ پاپا کسی انکوائری کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔اُن دنوں باقی مُلک میں اُترے اور بسے ہُوئے کشمیریوں پر پولیس کڑی نظر رکھتی تھی۔ کشمیری ہی نہیں، مُسلمانوں کا نام سُن کر ہی لوگ مکان، جگہ دینے سے انکار کر دیتے تھے۔

Scanned by CamScanner

ایک بار پاپا ہسپتال میں تھے۔ اُنہیں دیکھنے گئی تھی۔ وہیں ہمارے ڈاکٹر باسو نے بات چھیڑ دی۔ اور میرے رشتے کی بات نکل آئی۔ میری پڑھائی آخری درجوں پر تھی۔ میں نے ہندوستان ٹائمز میں رپورٹر کی نوکری کر لی تھی۔ ماں نے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

''کرلوں گی، اگر وہ ہنی مُون کے لئے کشمیر لے جائے تو!''

''کشمیر اب....'' پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا بھول جاؤ۔

اس سے زیادہ وہ بول نہیں پائے۔ اُنہیں بولنا منع بھی تھا۔ میں نے ماں سے کہا۔ ''تُمہیں نے تو کہا تھا کہ میرا جنم وہیں شُروع ہُوا تھا۔'' پاپا نے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے!!

اب اتنے برسوں بعد اپنے رُوٹس کو تلاش کرنے جا رہی تھی۔ دِل سینے میں ربڑ کی گیند کی طرح اُچھل رہا تھا، جب پلین سرینگر کے اَیر پورٹ پر اُترا۔ اَیر پورٹ سے باہر آتے ہی جو دیکھا وہ ہندوستان میں اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔

پہلا خیال یہ آیا، کیا جنگ شُروع ہو چکی ہے۔ کیا پاکستان نے حملہ کر دیا؟ سرینگر کی سڑکوں پر، کشمیری کم، ہندوستانی فوج زیادہ نظر آ رہی تھی۔ ٹینک، ٹرک، بندوقیں، چیک پوسٹ ہر سڑک پر بنکر، ہر گلی کے موڑ پر پہرہ!

جس بس میں نکلے، سرینگر پہنچتے پہنچتے تین جگہ رُکی۔ تین بار رائفلیں تانے فوجی اندر آئے۔ اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا۔ سامان ٹٹولا۔

''یہ کس کا ہے؟''

''اس میں کیا ہے؟''

Scanned by CamScanner

اور پھر اُتر گئے۔ بس آگے چل دی۔

اتنی سی دیر میں میری سانس گھٹنے لگی تھی۔ تیسری بار جب بس رُکی تو ایک سپاہی نے جاتے جاتے، مُجھے ریپ کرتی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

''تُو کہاں جا رہی ہے؟''

مُجھے تُو کا خطاب اچھا نہیں لگا۔ میں نے دھماکے پوچھا۔

''وہاٹ ڈو یُو مین؟ بائے وہیئر ایم آئی گوئنگ؟''

اُس نے ایک لمبی سی 'ہوں ں' کی اور مُڑ کے نیچے اُتر گیا۔ مُجھے لگا انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لیکن بس میں کوئی ہنسا نہیں۔

رہنے کے لئے مُجھے ایک نارمل سی 'لوجنگ' کی ضرورت تھی۔ چاہتی تھی ڈل کے پاس ہی کوئی جگہ مل جائے۔ پیسے ہوتے تو اوبروئے کی انیکسی میں جا کے رہتی۔

جھیل ڈل پر کائی کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور سبزہ اُوپر تک آ کے سڑ رہا تھا۔ چند ہاؤس بوٹ تھیں۔ ایک کنارے پر مجرموں کی طرح سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ اُجڑی ہوئی، خستہ، شاید گلتے گلتے وہیں پانی میں دفن ہو جائیں گی۔

بار بار میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ بار بار میں چڑ کے پونچھ رہی تھی۔ اور کوس رہی تھی خود کو۔ کس کشمیر کی بات کر رہی تھی؟ کہاں ہے تیرا اخروٹ کی لکڑی کا مُنقش پلنگ جہاں.... میرا گلا مستقل طور پر رُندھ گیا۔ اُس کے بعد میں نے اپنی نارمل آواز نہیں سُنی...!

Scanned by CamScanner

ایک لڑکی کو کوئی لو جنگ ہاؤس یا ہوٹل میں رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ نہ میری انگریزی کام آئی۔ نہ پرس میں پڑا ہندوستان ٹائمز کا آئی ڈینٹی کارڈ۔ پولیس یا ملٹری کی مدد لینا اور بھی نامناسب لگتا تھا۔ اُن کے ساتھ جُڑتے ہی لوگوں کی آنکھیں فوراً بیگانی ہو جاتی تھیں۔

خلیل نے پھر اپنی آٹو میں سامان رکھتے ہوئے کہا مُجھ سے!

'' آپ اکیلی ایں میم ساب، کوئی نیں رکے گا۔ کشمیری بوت ڈرتے ایں اندوستانی فوجیوں سے۔ کسی کو بھی پکڑ کے لے جاتے ایں اور پھر.... '' اُس نے وقفہ لیا۔ '' .... وہ آدمی کبھی واپس نئیں آتا۔ پتہ نئیں کس جیل میں گُم ہو جاتا اے۔'' اُس کے اندر کا غُصہ آٹو کی غوں غوں پر اُتر رہا تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں لے جا رہا تھا۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ شاید اپنے اندر کا ڈیزل جلا رہا تھا۔ '' کوئی آپ کو اوٹل میں نئیں رکے گا۔ فوج کو چھاپہ مارنے کا باہانہ مل جائے گا۔ پکڑ لے جائے گا اوٹل والے کو۔ مالک بوڑا ہوگا تو اُس کو نئیں لے جائے گا۔ اُس کا جوان بیٹا ہوگا، داماد ہوگا، بانجا، بتیجا (بھانجہ، بھتیجا) کوئی بی۔ اُن کی نظر کشمیر کے جوانوں پر اے۔ سب ختم کرتے جاتے ایں... '' اُس کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک گلی میں اُس نے اپنا آٹو روک دیا، اور مُڑ کے دیکھا میری طرف.... '' آپ لوگ کیا چاہتے ایں۔ کیا چاہیئے اَم سے۔ اَم کو امارے آل پر چوڑ دو بین۔ اب تو امارا سبزہ بھی لال ہو گیا اے۔ اماری زمین کی گاس بھی لال ہو گئی اے...!'' اُس کی آواز بھی میری طرح ہو گئی میں اپنی ہتھیلیوں میں مُنہ ڈھانپ کر بیٹھی رہی۔ ہندوستانی ہونے پر اتنی شرمندگی پہلے کبھی نہیں ہوئی مُجھے۔

خلیل میرا سوٹ کیس اُٹھائے اپنی بُوا کے گھر میں داخل ہوا۔ بُزرگ تھی۔ ادھیڑ

Scanned by CamScanner

عُمر کی۔ اکیلی تھی وہ۔

''تُم اِدر ہی رُک جاؤ بین۔ اماری بُوا کے پاس۔ اُم روز صبح آ کے لے جائے گا۔ جدر جانا ہوگا۔ اکیلی مت جانا کِدر..'' اور مُڑ کے چلا گیا، جانے کس بات پر آنکھیں پونچھتا ہوا۔ نہ پیسوں کا پوچھا۔ نہ کرایے کا!

مگر میں مانی نہیں۔ بُوا کو سمجھا کر نکل آئی۔ وہ گلی بھی ڈل سے بہت دُور نہیں تھی۔ کنارے کنارے چلتی ہوئی، اوبروئے پیلیس کے سامنے آ گئی۔ گیٹ بند تھا اور دُور تک کانٹے دار تاریں کھینچ دی گئی تھیں۔ داخلے کا راستہ شاید بدل گیا تھا۔ میں ایک طرف سے تاریں اُٹھا کر، اندر داخل ہوگئی۔ کُچھ پرندے پھڑ پھڑائے اور آپس میں بولے بھی۔ کُچھ اُڑ کے دُوسری شاخ پر بیٹھ گئے۔ چوکنے ہوگئے۔ میں دھیرے دھیرے اُوپر پیلیس کی طرف چڑھ گئی۔

مین گیٹ کے برامدوں میں چھت سے لے کر، زمین تک ترپالیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ہوٹل بند پڑا تھا۔ ایک حصّے میں فوجیوں کی ایک ٹکڑی رہ رہی تھی۔ اور اُن کا اپنا فوجی کچن چل رہا تھا۔ برامدوں میں سیلن بس گئی تھی۔ ناک پہ رُومال رکھ کے چلنا پڑتا تھا۔ انیکسی بند تھا۔ لان کُوڑے کباڑ سے اٹا پڑا تھا۔ اور دونوں چنار مُنہ پھیرے سر جھکائے، ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ غُلاموں کی طرح۔ اُن کے کندھوں میں خم آ گیا تھا۔ وہ بوڑھے لگ رہے تھے۔

گھُٹی گھُٹی سانس لئے میں بُوا کے پاس لوٹ آئی۔ بُوا نے بیچ کی میانی میں میرا بستر لگا دیا تھا۔

صبح صبح بچّوں کی چہچہانے کی آواز سُن کر جاگ گئی۔ جب سے آئی تھی، پہلی بار کوئی خوشگوار آواز کانوں میں پڑی تھی۔ اُٹھ کر پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔

Scanned by CamScanner

بُوا کے گھر کے پیچھے ہی ایک قبرستان تھا۔ جہاں بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پُرانی گری ٹوٹی قبروں کے بیچ بیچ میں بے شمار تازہ کچی پکی، مٹی سے ڈھکی قبریں تھیں۔ شاید یہی سب سے محفوظ جگہ تھی اُن کے کھیلنے کے لئے!"

میں نیچے آئی تو بُوا تھیں نہیں۔ غُسل کے لئے پانی رکھا تھا۔ تولیہ اور صابن بھی تھا۔ مُجھے عادت نہیں ہے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی، لیکن اب یہ ہوٹل تو تھا نہیں۔

آہستہ آہستہ پہلے ہاتھ سے بدن گیلا کیا۔ پانی سے مانوس کیا بدن کو۔ بہت ٹھنڈا تھا۔ پھر نہانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر پانی ڈالا، تو پانی لباس بن گیا۔ رُکتی تھی تو ٹھنڈ لگتی تھی۔ نہاتی گئی۔ نہاتی گئی۔ اور ساری رنجش دُھل گئی۔

بُوا کا ایک جوان بیٹا تھا۔ عزیز علی۔ کمپیوٹر سیکھ رہا تھا، جب دُکان ہی سے پولیس والے پکڑ کے لے گئے۔ سُنا ہے کسی پاکستانی سے ملا تھا۔ اُسی کے حوالے سے پکڑا گیا۔ نو سال ہو چکے، ابھی تک اُس کی کوئی خبر نہیں۔ جتنی لاشیں این کوؤنٹر میں گرتی ہیں۔ بُوا جا کر دیکھ آتی ہے۔ کبھی تھانوں میں، کبھی مُردہ گھروں میں۔ جس جیل کا ٹھکانہ پتہ چلتا ہے وہاں ڈھونڈ آتی ہے۔ سارے کشمیر کی جیلیں گھوم چکی ہے۔ مگر اب تک اُمید کی لَو پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ جلتی رہتی ہے۔ ماننے کو تیار نہیں۔ آنکھیں خشک ہو چکی ہیں، لیکن روتی ہے۔ میں نے کہا:

"بُوا ہو سکتا ہے پاکستان چلا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے، تہار جیل میں لے گئے ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"دِلّی میں...!" اُس کا چہرہ لٹک گیا۔ لیکن میں یہ نہ کہہ سکی کہ ہو سکتا ہے مَر گیا ہو۔

Scanned by CamScanner

ایک دن صبح صبح، پَو پھٹنے سے پہلے سارے علاقے کو گھیر لیا گیا۔ ملٹری کے ٹرک چاروں طرف آ کر کھڑے ہو گئے۔ دو سرچ لائٹ، دو ٹرکوں پر لگا دی گئیں۔ اور لاؤڈ سپیکر پر حکم ہوا کہ سب لوگ باہر آ کر قبرستان میں جمع ہو جائیں۔ تمام گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔ سہمے ڈرے لوگ، منٹوں میں ایسے باہر آ گئے جیسے بہت بار اس کی ریہرسل کر چکے ہوں گے۔ دن نکلا۔ دوپہر ہو گئی۔ بھوکے پیاسے تمام لوگ، بغیر کسی حیل وحجت کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ گھروں کی تلاشی جاری رہی۔

دوپہر کے وقت میں نے ہمت کی۔ کرنل سے انگریزی میں جا کے بات کی۔ اُس نے بُوا کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی جو بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہی تھی۔ بُوا کو جب میں گھر چھوڑ کر لوٹی تو لوگوں کی نگاہوں میں شک تھا۔ حقارت تھی، اور بیگانگی تھی۔ میں سہم کر، ایک کونے میں جا کے بیٹھ گئی۔

شام ہونے سے پہلے ملٹری پولیس کا ڈرامہ ختم ہو گیا۔ لوگ گھروں کو لوٹنے لگے۔ میں لوٹی تو بُوا کے دروازے پر تالا لگا تھا، اور میرا سارا سامان، سوٹ کیس سمیت دروازے کے باہر رکھا تھا۔

سامان گھسیٹتی ہوئی میں سڑک تک آ گئی۔ اور ڈل لیک کے کنارے بنی دیوار پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں سب کچھ کھو چکی تھی جب ایک شخص نے رُک کر پوچھا۔

''آپ کو کِدر جانا اے میم ساب؟''

میں نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ ''ایک رات کے لئے کسی بوٹ ہاؤس میں ٹھہرنا چاہتی ہوں۔''

''بوٹ آؤس میں تو اب کوئی گیسٹ نئیں رہتا میم ساب! بوٹ آؤس ہی نئیں

اے۔ایک آدمی اے، وہ خود ہی ریتا اے۔اُس کا اپنا گراے۔''

''کہاں...؟''

اُس نے اشارے سے بتایا۔

''وہ اُدر وزیرے کا بوٹ آؤس اے!''

''کس کا...؟'' میں اچانک اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی۔وہ پھر بولا۔

''وزیر علی، اُس کا نام اے۔بُزرگ آدمی اے۔''

''مُجھے وہاں تک پہنچادو گے؟ میں اُس سے ریکوسٹ (request) کروں گی، منت کروں گی، رکھ لے گا۔صرف ایک رات کے لئے!''

کُچھ حیرت، کُچھ بے دِلی کے ساتھ وہ شخص تیار ہوگیا۔اور میرا سوٹ کیس اُٹھا لیا۔''چلو میم ساب۔مگر وہ کسی گیسٹ کو لیتا نہیں اے۔کوئی آتا بی نہیں اے۔گیسٹ تو کیا میم ساب...'' وہ چلتے چلتے بول رہا تھا: ''اب تو رُوس اور وہ جانے کاہاں کاہاں سے برڈ آتے تھے۔وہ بھی نہیں آتے اس جھیل میں۔''

پتہ نہیں کیوں، مُجھے اُمید ہوگئی تھی کہ وزیر علی وہی ہوگا۔وزیرا۔جو بچپن میں مُجھے چُرا کے لے گیا تھا۔یا میں چاہتی تھی کہ لے جاتا۔

مگر وہ نہیں نکلا۔وہ کوئی اور تھا۔پھر بھی ایک رات کے لئے مُجھے اُس بوٹ ہاؤس پہ رکھنے کے لئے تیار ہوگیا۔میرے لئے بستر بھی بچھادیا۔فرش پر۔وہاں کوئی منقش پلنگ نہیں تھا۔

اگلے روز میں واپس آگئی۔اَیرپورٹ پر۔تین بار، تین جگہ۔پُورا سامان کھول کر چیک کیا گیا۔میرے 'براز' اور پینٹیاں جھٹک جھٹک کر دیکھی گئیں۔وہ دیکھ دیکھ کر میری

Scanned by CamScanner

چھاتیوں میں درد ہونے لگا۔ ہر جگہ دو دو قطاریں تھیں دو دو خیمے تھے اور باڈی سرچ کے لئے عورتیں جس طرح چھوتی تھیں، لگتا تھا لیسبئن ہیں۔ سب کی سب۔ تیسرے خیمے میں جب جُوتے موزے اُتروا کے پُورے بدن پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' مُجھے کہنا پڑا۔

''ماہواری سے ہوں۔ مینسٹرل پیریئڈ چل رہا ہے۔'' اُسی وقت ساتھ کے خیمے سے کوئی پہچانی سی، رُندھی ہوئی آواز سُنائی دی!

''کون ہے وہاں ؟'' میں نے پوچھا۔ اور تقریباً دھکیل کر ساتھ کے خیمے میں گھُس گئی۔ سامنے بُوا کھڑی تھی۔ ہاتھ میں دِلّی کا ٹکٹ جھول رہا تھا۔ ناڑا کھُلا تھا۔ سلوار نیچے گر گئی تھی اور کُرتا اُٹھائے، رسّی کی طرح پھَسی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

''تلاشی کو بس یہی ایک جگہ بچی تھی، وہ بھی دیکھ لو...'' مُجھے دیکھتے ہی اُن کی گھگّی بندھ گئی۔

''یہ میں کیسے مُلک میں آ گئی ہوں؟ یہ میرا ہی مُلک ہے کیا؟''

اور وہیں اپنی شلوار پر ڈھیر ہو گئیں۔

مُجھے خلیل کی چیختی ہوئی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

''آپ لوگ کیا چاہتے ایں۔ کیا چاہیئے اَم سے۔ اَم کو امارے آل پر چوڑ دو بین، اب تو امارا اسبزہ بھی لال ہو گیا اے۔ اماری زمین کی گاس بھی لال ہو گئی اے...!''

یہ افسانہ 'حمرہ قریشی' کے نام!

Scanned by CamScanner

ایک خیال نہ دِکھتا ہے، نہ چُپ ہوتا ہے
ذہن کے سناٹے میں اِک جھینگر ہے، بولتا رہتا ہے!

Scanned by CamScanner

سوئمبر

صُبح صُبح اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ بہت صُبح!

وہ بہت حیران ہوئی۔ اُس کی آنکھ لگی کیسے؟ کب؟ سورن کے کہنے پر بھی اُس نے نیند کی گولی نہیں لی تھی۔ رات کو دیر تک بیٹھ کر جب وہ ٹی۔ وی پر فلم دیکھ رہی تھی، تب بھی وہ بالکل رِلیکسڈ (relaxed) تھی۔ فلمیں بہت دیکھتی تھی۔ چاؤ قسم کی۔ مار دھاڑ والی۔ بہت سچی لگتی تھیں اُسے! سب کُچھ ہوسکتا ہے، اور کُچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہی تو زندگی ہے۔ لیکن اپنی زندگی کی آخری رات وہ جاگتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ سو کیسے گئی؟ ''بم'' کو نیند کیسے آسکتی ہے؟ وہ تو سراپا ایک مشین ہے۔ اور مشین کی آنکھ کیسے بند ہوسکتی ہے!

اُسے شک ہُوا، رات سورن نے، چوری سے اُس کی کوفی میں نیند کی گولی تو نہیں گھول دی تھی۔ سورن اُس کا محافظ تھا۔ اگر وہ اپنے میشن سے چُوکے یا کمزور پڑے تو فوراً گولی سے اُڑا دے گا اُسے!

اُسے ایک پل غصّہ آیا۔ سر بھنّا گیا۔ میں نے جب نہیں کہہ دیا تو نہیں۔ ہرگز

نہیں! اُس کے ساتھ کوئی زبردستی اُسے بالکل پسند نہیں۔ اور اعتبار نہ کرے، یہ تو کبھی برداشت نہیں ہوسکتا اُسے۔ وہ اپنے ذہن کو بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ کوئی فیصلہ عارضی طور پر نہیں کرتی۔ لیکن دُوسرے ہی پل اُس کا غصہ غائب ہوگیا۔ جب اُسے یاد آیا کہ کوفی تو اُس نے خود ہی اُٹھ کر بنائی تھی۔ بلکہ اُٹھتے ہوئے اُس نے سورن سے پُوچھا تھا:

''کوفی ___؟''

سورن نے اِنکار میں سر ہلا دیا تھا۔

وہ بیٹھا، کاغذ پر الجبرا کے سوال حل کر رہا تھا۔ عجیب شوق تھا یہ بھی۔!

جب ٹی وی بند کر کے، وہ بستر پہ لیٹی تھی، تو ایک بار 'ماں' کا خیال آیا تھا۔ اور ساتھ ہی وہ منظر آنکھوں پر ''سوئچ آن'' ہوگیا، جب ناریل کے درختوں میں، گاؤں کے سردار نے، اُس کی ماں کا ریپ کیا تھا۔ اُس نے ''سوئچ آف'' کر دیا۔ سردار چیف منسٹر کی زمینوں کا ٹھیکیدار تھا۔ اُسے ترس آنے لگا تھا ماں پر۔ اور اس جذبے سے اُسے سخت نفرت تھی۔ پاس ہی پڑا ہُوا، ناریل چھیلنے والا گنڈاسا بھی تو پڑا تھا۔ ماں نے اُٹھا کے آنتیں کیوں نہ چیر دیں اُس آدمی کی۔ منظر پُوری طرح تحلیل نہیں ہُوا تھا۔ آنکھوں کے پانی پر ابھی تک تیر رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر بتّی گُل کر دی۔ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا جو نظر نہیں آیا۔ ایک اندازہ سا ہُوا تھا۔ تاریخ ابھی بدلی نہیں۔ ایک تاریخ ابھی باقی ہے۔

اب صُبح صُبح دیکھا تو تاریخ بدل چُکی تھی۔ یہ تاریخ وہ بدلتے ہُوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ آخری موقع اُس نے گنوا دیا تھا۔ نیند میں، آسمان پر بہت ہی ہلکی سی روشنی تھی۔ مگر کافی تھی گھڑی دیکھنے کے لئے! وہ اُسی طرح بستر میں پڑی رہی۔ کیا وہ سچ مُچ بہت جلدی

Scanned by CamScanner

سوگئی تھی۔ لاشعور میں ضرور تناؤ ہوگا۔ اِسی لئے بتّی گُل کرتے ہی نیند آ گئی۔ لاشعور کی من مانی بھی اُسے پسند نہیں آئی۔

اِسٹوو کی آواز آ رہی تھی۔ سورن جاگ چُکا ہوگا۔ پتہ نہیں وہ سویا بھی کہ نہیں۔ وہ تو یُوں بھی ''اِنسوسونیا'' (Insomnia) کا مریض تھا۔ سوئے نہ سوئے، وہ ہمیشہ ایک ہی سا رہتا تھا۔ الجبرے کے ہندوسوں کی طرح! اچانک اُسے لگا، سورن کی شکل بھی الجبرے کے بیٹا، جیسی ہے۔ کان دونوں سروں سے باہر کی طرف مُڑے ہُوئے۔ مِلا دو تو انگریزی کا ایکس، 'X' بن جائے۔ اور ناک جیسے وائے 'Y' کو اُلٹا لٹکا دیا ہو۔ اُلٹی لٹکی غُلیل۔ اور آنکھیں..... الجبرے سے کوئی تشبیہہ نہیں ملی۔ اِس عجیب سے کھیل پر وہ خُود ہی مُسکرا دی۔ الجبرے سے وہ کتنا گھبراتی تھی، جب سکول میں تھی۔ اچھا ہوا زیادہ دن نہیں پڑھنا پڑا۔ تاڑی باز چاچا نے اُٹھالیا۔

ایک سرسراہٹ ہوئی اور اُس نے دیکھا، الجبرے کا ہندسہ کوفی کا پیالہ لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے پہلی بار اُس نے فریم میں لگی سورن کی تصویر کو دیکھا تھا۔ اُس کے دوست، بنجم پلّی کی کوٹھری میں ___! بنجم پلّی کو، سردار کے لوگ مار کے اُس کے گھر کے باہر پھینک گئے تھے۔ اور وہ اپنے تاڑی باز چاچا کو ڈھونڈنے وہاں گئی تھی۔ بنجم، چاچا کا چھوٹا بھائی تھا۔ اِس چاچا کو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سُنا تھا ہائی ٹائیڈ (High Tide) میں، وہ ڈونگی لے کر کھاڑی کے راستے، کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ اور گاؤں کے ملّی لوگ چھپ چھپ کر اُس سے ملنے جاتے ہیں۔ اِسی بنجم پلّی کی زمین، سی ایم نے خریدی تھی۔ گاؤں کا سردار سی ایم کا آدمی تھا۔ اور سی ایم، پردھان منتری کا آدمی تھا، اور دِلّی میں رہنے والے پردھان منتری کو، سکھا پورم کے بنجم پلّی سے خطرہ تھا۔

Scanned by CamScanner

کوفی پی کر وہ نہانے چلی گئی۔ دیر تک شاور کے نیچے بیٹھی رہی۔ کوئی خاص بات نہیں سُوجھی۔ اِتنی معمولی قسم کے خیالات تھے۔ کہ جیسے صابن کی شکل اُسے پسند نہیں آئی۔ یہ بھی سوچا کہ آئندہ کے لئے وہ صابن بدل دے گی۔ لیکن آئندہ کب؟ یہ غُسل بھی تو ..... آخری غُسل تھا۔ بیچ میں پانی چلا گیا۔ شاور بند ہوگیا۔ جھنجھلاہٹ ہُوئی اُسے۔ ''بلڈی شِٹ!'' ___ کل ہی مالک مکان کو جا کر..... پھر کل؟ فلم کا شاٹ بیچ ہی میں کٹ گیا۔ آہستہ آہستہ ایک احساس اُبھر رہا تھا۔ آخری دن کا احساس! اِس آخری دن کے ساتھ ایک ڈرام کا احساس بھی اثر کر رہا تھا۔ ہلکا ہلکا سا۔ ابھی تک اُس کا پُورا رِمپیکٹ (تاثر) نہیں پڑا تھا۔ شاور پھر سے شُروع ہو چُکا تھا۔ صابن کی جھاگ جو کُچھ کُچھ سُوکھ گئی تھی، اُس کے جسم سے اُترنے لگی۔ سانپ کی کینچلی کی طرح۔ خیالات بھی ایک گُنجان گلی کے ٹریفک کی طرح ہوتے ہیں ___ ایک خیال پیچھے سے ہارن بجاتا ہُوا آیا اور 'اَور ٹیک' (Overtake) کر گیا۔ وہ تولیہ لے کر نہیں آئی۔ بغیر تولیئے ہی کے غُسلخانے میں چلی آئی۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہُوا۔ ایک بار پھر اپنے لاشعور سے جھنجھلاہٹ ہُوئی۔ وہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اُس کے ذہن میں کوئی تناؤ ہے: اور جب تک وہ خیال کوئی اور گلی مُڑ گیا۔ جب پانی بند کیا اور اور غُسلخانے میں خاموش ہُوئی تو اُس کا جی چاہا، کوئی انوکھی سی بات کرے آج۔ ایسی کوئی بات کہ جیتے رہنے کی ساری حسرت مِٹ جائے۔ ایسی کوئی بات جس سے اچھا سا ''دی اینڈ'' لگ جائے۔ ایک سرسری سی خواہش پیدا ہُوئی۔ فوٹو کھچانے کی۔ اور جب تک نہا کے باہر آئی یہ خواہش ذہن میں پُختہ ہو چُکی تھی۔ دِماغ نے بات طے کر لی تھی۔ دوسرے کمرے میں سورن کو بتانے گئی تو اب وہ نہانے جا چُکا تھا۔

فوٹو گرافر کے ہاں جاتے ہوئے راستے میں شِو مندر آیا۔ سورن نے اُس کی طرف دیکھا۔ ٹیکسی رُکوائے یا نہیں؟ اُسے معلوم تھا وہ اُس مندر میں جایا کرتی ہے۔ کبھی کبھی! اُس نے

Scanned by CamScanner

بھی دیکھا سورن کی طرف۔ اور گردن کی جنبش سے ہی ٹیکسی روکنے کو منع کر دیا۔ مندر جانا بھی کچھ بے مقصد لگا آج۔ یا پتہ نہیں کیوں، جی نہیں چاہا۔ یا شاید ڈر لگا۔ بھگوان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ یا حوصلہ مانگنے کے خیال سے، اپنے آپ پر رحم سا آیا۔ وہی لجلجا سا احساس!

فوٹو گرافر تک پہنچتے پہنچتے اُس نے ایک اور فیصلہ کیا۔ راجکماری کو خط لکھے گی۔ گاؤں کی سہیلی اُس کی۔ ایک سال بڑا ملی تھی اُسے۔ شادی کی زندگی میں پس رہی تھی۔ گھٹ رہی تھی۔ اُس کے آنسو دیکھ کر اُس نے تھپڑ دے مارا تھا۔ ''اُلو کی پٹھی!'' اور موٹی سی گندی سی گالی دی تھی اُس نے۔ راجکماری کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''اوماں ___ یہ گالی تیری زبان پر کیسے آئی۔ ایسی گالی تو وہ دیتے ہیں!''

''تجھے.....؟''

''ہاں! سردار اُنہیں دیتا ہے۔ وہ مجھے دیتے ہیں۔''

ٹیکسی کا شیشہ کھول کر اُس نے باہر تھوک دیا۔ پتہ نہیں مُنہ کا سواد کیوں خراب ہو رہا تھا۔ بابو لال فوٹو گرافر کے ہاں پہنچتے ہی غٹا غٹ دو گلاس پانی پی گئی وہ۔

بابو لال کا بیٹا شہر سے آیا تھا۔ چست بازوؤں کی جرسی پہنے بہت سمارٹ (smart) لگ رہا تھا۔ بات چیت میں انگریزی کے لفظ بہت بولتا تھا۔ اُسے اچھا لگا وہ۔ وہ نیا کیمرہ لے کے آیا تھا۔ اُسی نے سٹول پر بٹھایا اُسے۔ پوز بنایا۔ بڑا لمبا نام بتایا اپنا، اور انگریزی میں یہ بھی کہا۔

''تم صرف اے۔ کے (A.K.) بُلا سکتی ہو۔ لوگ ایسے ہی بُلاتے ہیں مجھے!''

اُس نے محسوس کیا سورن آج کچھ زیادہ ہی سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ دُوسرا پیکٹ تھا

Scanned by CamScanner

جو اُس نے جیب سے نکالا تھا۔ اچانک سورن بولا۔

''اے۔ کے۔، شام کو جلسہ ہے سکھا پورم میں! سی۔ ایم کے ساتھ پی۔ ایم آ رہا ہے۔ چلنا ہے؟''

''اندر جانے دیں گے؟'' اے۔ کے نے پُوچھا۔

میں نے کاپی پنسل ہاتھ میں لے لی ہے۔ تو کیمرہ لٹکا لے گلے میں! میں کہہ دُوں گا میرے ساتھ ہے!''

''پاس ہے تیرے پاس؟''

وہ بولی! ''میں جو ہُوں!'' چوبیس گھنٹے میں پہلی بار ہنسی وہ۔ ''میں ہار ڈالوں گی۔ تُو فوٹو لینا۔'' اے۔ کے، کے ساتھ بے تکلفی کا لہجہ اچھا لگا اُسے۔

شام بڑی بھیڑ تھی جلسے میں۔ اُس کے دِل کی دھڑکن تیز تھی۔ سُنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کانوں میں ''واک مین'' (walkman) لگا رکھا ہے۔ اُس کا جبڑا درد کرنے لگا تھا۔ خوف اگر تھا لاشعور میں، تو اُس نے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ زور سے۔ سورن نے جتنی بار دیکھا اُس کی طرف، جبڑا ہلتا ہُوا دکھائی دیا۔ کُچھ پیس رہی تھی داڑوں میں۔ کیا تھا؟ غصہ؟ خوف؟ یا چیخ!!

اچانک شور ہُوا۔ پی ایم آ گئے۔ بتیاں جل گئی تھیں۔ آٹھ دس کاروں کا ایک کارواں آ کر رُکا۔ بیک لائٹ میں، اُوپر تک اُڑتی ہُوئی گرد دِکھائی دی۔ کاریں نہیں دِکھائی دیں۔ مُنڈیوں کا ایک ہجوم مین گیٹ کی طرف لڑھکتا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ 'واک مین' کی 'وَولیم' (volum) بڑھ گئی۔ اے۔ کے آگے آگے تھا۔ سورن نے کندھے کے تھیلے سے ہار نکالا

Scanned by CamScanner

اور بڑھایا اُس کی طرف۔لیکن اُس نے دیکھا نہیں۔ ہاتھ پاؤں لکڑی کے ہو رہے تھے۔ خون کی گردش جام ہونے لگی تھی۔سورن کو فکر ہُوئی۔ وہ اُس کا پاسبان تھا۔اور پاس آ گیا۔ سورن کے دماغ میں الجبرے کے سوال قلابازیاں کھا رہے تھے۔اُن کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

سامنے سے آتی ہُوئی، چھٹتی ہُوئی، بھیڑ میں اچانک ہی پی۔ایم کا چہرہ اُبھرا۔اور اُس نے یُوں نظر سے پھانس لیا جیسے کانٹے سے مچھلی پھانس لی جاتی ہے۔

جبڑے کی حرکت بند ہوگئی۔خوف کی ہڈی، داڑ کے نیچے ٹوٹ گئی۔خون کی گردش دھیرے دھیرے نارمل ہونے لگی۔ سورن نے پھر دیکھا۔ اُس کا چہرہ اب ریلیکس (relax) ہوگیا تھا۔اب کوئی خوف نہیں۔کونفلکٹ (Conflict) نہیں۔لیکن عجیب لگی اُس کی نظر جو پی ایم پر ٹکی ہُوئی تھی۔جیسے عشق اُمڑ آیا ہو۔آنکھیں مُسکرانے لگی تھیں۔ جیسے لاڈ کر رہی ہوں۔اور وہ بڑے اطمینان سے پی ایم کی طرف بڑھ رہی تھی۔سردار بھیڑ ہٹا رہا تھا۔''والنٹیرز''(Volunteers) کے ساتھ۔وہ تیر رہی تھی۔پی ایم کی طرف!

کئی آنکھیں کھِل اُٹھیں اُس کے چہرے پر۔کانوں پر، ماتھے پر، ٹھوڑی پر، گدی پر۔پُورا چوگردہ نظر آ رہا تھا اُسے۔سورن سے ہار لیا اُس نے اور سچ مُچ ایسے پہنایا، جیسے سوئمبر کی رسم میں جیون ساتھی چُن لیا ہو۔ساتھ جئیں گے۔ساتھ مریں گے۔ ایک دھماکے کے ساتھ، وقت پھٹا اور دونوں اتہاس میں داخل ہوگئے۔امر ہوگئے!!

Scanned by CamScanner

وِدائی

نہ تو کوئی نام تھا چٹھی پر، نہ پتہ۔ ہاتھ کا لکھا رقع تھا ایک نہایت معمولی سے لفافے میں۔ (گورو نے) دروازہ کھولتے ہُوئے اگر پائیدان نہ ہٹایا ہوتا اُس نے، تو شاید نظر ہی نہ آتا۔ چوری ہو جانے کے ڈر سے، وہ روز پائیدان اندر لے کر دروازہ بند کرتا تھا۔ اور جس نے بھی چٹھی دروازے کے نیچے سے ڈالی تھی، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اندر پائیدان رکھا ہے۔ اور چٹھی اُس کے نیچے چلی گئی ہے۔

چٹھی میں لکھا تھا__

''یانگ سُوئی آئی ہے، وئیٹ نام سے۔ تُم سے ملنا چاہتی ہے۔ ہم لوگ شام کا شیاتل کے گھر مل رہے ہیں۔ اپنی نئی کوتائیں لے کر آنا۔''

''کوتا؟''

گورکھ پانڈے کو بات سمجھ نہیں آئی۔ کیسی کوتا؟ نہ تو خود کوی ہے، اور نہ کِسی کوی کو

Scanned by CamScanner

جانتا ہے اس ہوسٹل میں۔ اور کوئی نام بھی تو نہیں ہے خط پر۔ نہ اُوپر، نہ نیچے۔ خط موڑ کے اُس نے جیب میں رکھ لیا۔ بیڈ کے نیچے سے ٹٹول کر 'کیڈز' نکالے، پہنے اور جوگنگ کے لئے نکل گیا۔ یہی اُس کا روز صبح کا معمول تھا۔ ہوسٹل سے نکل کر، کالج گراؤنڈ پار کر کے، ہائی وے کے اُس پار ایک پارک جو بن رہا تھا، اُس کے دو راؤنڈ لگا کے واپس آتا تھا۔ گورکھ پانڈے، جسے لڑکے مشہور نیکسلائٹ گورکھ پانڈے کی نسبت سے گوڑو کہہ کے بُلاتے تھے، بالکل فٹ تھا۔

دو ایک روز پھر وہی ہُوا۔ جوگنگ سے واپس آ کر اُس نے اپنے کمرے کی صفائی کی۔ جھاڑنے کے لئے پائیدان اُٹھایا، تو پھر ایک چٹھی ملی۔ ویسی ہی، سادہ سے کاغذ پر لکھی، معمولی سے لفافے میں رکھی۔ اس بار بھی، نام پتہ کُچھ نہیں تھا۔ تاریخ بھی نہیں تھی۔ ہاں اتنا سا خطاب بڑھ گیا تھا ___

''دادا، بہت مِس کِیا آپ کو۔ یانگ سُوئی آج کلکتہ جا رہی ہے، وہاں سے واپس چلی جائے گی۔ اُس نے آپ کا بہت انتظار کیا۔ ٹرین سے جا رہی ہے۔ ملنے آسکو تو ساڑھے چار بجے سٹیشن کے باہر آ جانا۔ میں وہیں مِلوں گا۔ پ''

اِس بار اُسے ہینڈ رائٹنگ کُچھ الگ لگی۔ زیادہ ٹھہراؤ سے لکھا ہُوا خط تھا، اور ہینڈ رائٹنگ فی میل (نسوانی) لگی۔ اُس نے آخری جُملہ دُوبارہ پڑھا۔ ''وہیں مِلوں گا!'' 'پ' پریتی یا پُشپا تو نہیں ہو سکتی۔ کوئی 'پارتھو' ہوگا۔ اُسی وقت خیال آیا، پہلا خط تو ٹریک سُوٹ کی جیب میں تھا۔ اور ٹریک سُوٹ لانڈری میں ___

رائٹنگ ٹیبل کا دراز کھول کر، خط اُس میں ڈال دیا۔

Scanned by CamScanner

کچھ دیر تک وہ خط یاد رہا۔ چائے پیتے ہوئے اور ناشتہ کرنے تک، ایک چھوٹی سی دلیل اپنے آپ ہی ذہن میں بن گئی تھی۔ کسی کا رومانس چل رہا ہے۔ وہیٹ نامی کسی لڑکی کے ساتھ، اور جو ملنے نہیں گیا ہے، وہ یا تو رُوٹھا ہوا ہے یا جھانسہ دے رہا ہے۔ کالج پہنچتے پہنچتے کہانی تحلیل ہو چکی تھی۔

اُس کے بعد بہت روز تک کوئی خط نہ آیا۔ لیکن صبح یا شام کو جب بھی دھیان آجائے تو پائیدان اُٹھا کر دیکھنے کی عادت سی لگ گئی اُسے۔ عادت بھی نہیں، بس یُوں ہی، ایک تجسّس سا، ایک curiosity۔ لیکن چٹھی تھی کس کے لئے؟ اُس کے پلّے نہ پڑا۔ اور اُس نے پتہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اُس کے بعد پھر بہت روز تک کوئی خط نہیں آیا۔ کوئی رقعہ نہیں ویسے اور بہت کچھ ہو رہا تھا شہر میں۔ نیکسلائٹ مُوومینٹ (تحریک) کا زور بڑھ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی حادثہ، کوئی نہ کوئی بلاسٹ (اسپوٹ) ہر روز ہو ہی جاتا تھا۔ کالجوں میں طلبا ہی کی نہیں، پروفیسروں کی حاضری بھی کم ہونے لگی تھی۔ زیادہ وقت لائبریری یا کینٹین میں کٹتا۔

کینٹین میں ایک ہلکی سی کھُسر پھُسر پک رہی تھی۔ اُس نے پکنے دی۔ لیکن جب بے چینی محسوس ہونے لگی تو اُس نے پُوچھ ہی لیا ایک دوست سے۔ دوست اُسے جلدی سے باہر گراؤنڈ میں لے گیا اور بتایا:

''ایک گھوشٹی ہونے والی ہے شہر میں۔ شاید 'راجپورے' میں۔''

''کیسی گھوشٹی؟''

''ساہتک ہے۔ لیکن سیاسی بھی ہے۔ ہوسکتا ہے....'' کان کے اور پاس آکر

Scanned by CamScanner

بولا۔ ''شاید گورو بھی آئے۔''

''وہ کون ہے؟''

''تمہارا ہم نام۔ گورکھ پانڈے۔''

وہ گورکھ پانڈے بھی بہار ہی سے تھا، لیکن نیکسلائٹ تحریک کے دوران بنگال میں کافی مشہور ہو گیا تھا۔ کالجوں کے نوجوان، اخباروں اور رسالوں میں اُس کی کوتائیں پڑھ کے جوش میں آجاتے تھے۔ جب کبھی اُس کی نئی نظم (کویتا) آتی، تو شہر میں ایک لہری دوڑ جایا کرتی تھی اور لڑکے لڑکیاں، پولیس کی نظر بچا کے، ٹرابوں اور بسوں میں اُس کی کوتائیں چپکا جایا کرتے تھے۔ لوگوں نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ اُس کی تصویریں چھپتی تھیں، لیکن ایک سے دُوسری نہیں ملتی تھی۔ کہتے ہیں پولیس کو اُس کی تلاش رہتی تھی، اس لئے وہ ہر بار اپنا حُلیہ بدل لیتا تھا۔ کُچھ لوگوں کا تو خیال تھا کہ اُن میں سے ایک بھی تصویر اُس کی نہیں تھی۔

نکسل باڑی تحریک، بنگال سے اُمڑ کے بہار میں زور پکڑ رہی تھی۔ گورکھ بی۔اے کا ودّیارتھی تھا۔ کسی بھی سیاسی تحریک سے دُور دُور تک لینا دینا نہیں تھا۔ لیکن لٹریچر کا ودّیارتھی ہونے کی نسبت سے، گورکھ پانڈے کی نظمیں اُس نے پڑھی ضرور تھیں۔ اور اُن کی تپش بھی محسوس کی تھی۔

ایک اور دوست نے کینٹین میں بیٹھے ہُوئے کہا تھا ایک بار۔

''گورو، ایک بار سُن لو گے، تو کپڑوں میں آگ لگ جائے گی۔''

''تُم نے سُنا ہے؟''

Scanned by CamScanner

''ارے، اتنا بھاگیہ شالی ہوتا تو کیا زندہ بیٹھا ہوتا تمہارے سامنے؟ میری راکھ پڑی ہوتی یہاں، پلیٹ میں!'' اور ہنس دیا۔

اُسی دوست کے ساتھ وہ اُس گھوشٹی میں چلا گیا۔ لیکن نشچت کچھ بھی نہیں تھا۔ گھوشٹی کہاں ہوگی۔ کیسے ہوگی۔ اور کون کون ہوں گے۔

ابھی آدھے راستے ہی میں تھے کہ ٹریفک اِدھر اُدھر divert ہونے لگا۔ کئی جگہ پر ٹریفک جام ہُوا۔ بادل چوک تک پہنچتے پہنچتے جیسے سارا شہر ہی جام ہوگیا۔ سٹیشن روڈ بالکل ہی بند کردی گئی۔ پتہ چلا کہ عین چوک میں ایک بم پھٹا ہے اور پولیس کمشنر کی جیپ اُڑ گئی ہے۔ پولیس کمشنر بچ گیا۔ گورکھ اور اُس کا دوست بس چھوڑ کر پیدل ہوسٹل تک واپس آئے۔ کئی گھنٹے لگ گئے۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اچانک پائیدان پر دھیان چلا گیا۔ گورکھ نے اُٹھ کر دیکھا۔ ویسا ہی ایک رُقعہ پڑا ملا۔ بڑی جلدی میں لکھا ہُوا تھا۔ ''st.Agnes Church کے پیچھے 's' ملے گی۔ گاڑی ریڈی ہوگی۔ کوہیما کے لئے۔ اور اب ذرا بھی دیر نہ کریں۔ 'پ' ''___

گورکھ کو کہانی کے اُدھیڑ بن ہی میں نیند آ گئی۔ صُبح صُبح ایک شور نے جگا دیا۔ پولیس نے سارا ہوسٹل گھیر رکھا تھا۔ سب کو باہر کے، کمپاؤنڈ میں لائن سے کھڑا کیا جا رہا تھا۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لی جا رہی تھی۔

اچانک ایک سپاہی دوڑا دوڑا، انسپکٹر کے پاس آیا۔ ''سر، مل گیا اُس نے سائینائڈ

Scanned by CamScanner

کھالیا ہے۔'' انسپکٹر اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

چھتیس ستائیس سال کا نوجوان ہوگا۔ چہرے پر خوبصورت تراشی ہُوئی داڑھی، رِم لینس چشمہ ابھی تک اُس کے چہرے پر لگا ہُوا تھا۔

''کس کمرے سے ملا؟'' ایک نے پُوچھا۔

''فِفٹی ون!'' وہ گورکھ کے ساتھ والا کمرہ تھا۔

''ہے کون؟'' گورکھ نے پُوچھا۔

''جانتے نہیں؟ مشہور نیکسلائٹ گورکھ پانڈے!'' گورکھ یکدم سُن ہوگیا۔

''بہت دنوں سے خبر تھی، آجکل ہمارے شہر میں ہے۔ کہیں چھپا ہُوا ہے۔

''اُف ہمارے ہی ہوسٹل میں تھا۔ اور کسی کو خبر تک نہیں۔''

گورکھ کے ہاتھ ٹریک سُوٹ کی جیب میں تھے۔ اور مُٹھی میں وہ خط مسل رہا تھا۔ جو ٹراؤزر (trouser) کے ساتھ ہی لانڈری سے دُھل کے آیا تھا۔

پنچ نامہ تیار کرتے ہُوئے، پولیس انسپکٹر، ہوسٹل وارڈن کو وہ چھوٹا سا خط دِکھا رہا تھا۔ جو اُس کی جیب سے نکلا تھا۔ بنگالی میں لِکھا تھا۔

''اے بار وداعی دے ماں۔ گھورے آشی!''

(اِس بار وداعی دے ماں۔ ذرا گھوم کے آتا ہُوں۔)

Scanned by CamScanner

اٹھنّیاں

چندّو، تیسری جماعت سے جو بھاگا، تو سیدھا بمبئی آ کے دم لیا۔ یہ اور بات ہے کہ آج وہ منسٹر صاحب کے بنگلے پر نوکری کرتا ہے۔ لیکن اُسے یاد ہے سب!

تین دن تک، رات دن جاگنے کے بعد، جب پہلی بار بائیکلہ کے فُٹ پاتھ پر سویا تھا تو آدھی رات کو حوالدار نے ٹھڈّے سے جگا کے پُوچھا تھا۔

''کیوں بھائی؟ کون سی یُو پی سے آیا ہے؟''

''فیض آباد سے۔''

''اچھا....؟ نکال اٹھنّی! فُٹ پاتھ پہ مُفت میں نہیں سونے کا۔ کیا؟''

چندّو کو لگا۔ اُسے کسی فلم میں دیکھا ہے۔ وہاں بھی 'کیا؟' بول کے بات کرتا تھا۔

''پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ اِسی لئے تو شہر آیا ہوں۔''

''یہ شہر نہیں ہے۔ ممبئی ہے۔ کیا؟ ___ مہانگر بولتے ہیں اس کو۔ چل نکال اٹھنّی!''

پاس پڑے جھمرّو کی آنکھ کھل گئی۔

''اے دیوا۔ کیوں تنگ کرتا ہے؟ ___ یہ لے اٹھنی اور سونے دے۔''

جھمرّو نے تکیے کے نیچے بکھرے چلّر سے ایک اٹھنی اُٹھائی اور اُچھال دی اُس کی طرف۔ دیوا نے لپک لی اور بولا:

''تیرا کوئی سگے والا ہے کیا؟ تُو تو ملیا ہے سالا۔''

حولدار ہاتھ کی اٹھنیاں بجاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چندو کو سمجھ نہیں آیا۔ کیسا شہر ہے یار۔ مارتا بھی ہے۔ پالتا بھی ہے۔

باقی رات اُسے پھر نیند نہیں آئی۔

صبح اُٹھ کے جھمرّو سے مُلاقات ہوئی۔

''گاؤں سے آیا ہے؟ بالوں میں تیل لگا کے ہیرو بنے گا؟''

''نہیں یار میں تو ___ ___''

''اے.....!''

جھمرّو نے ڈانٹ دیا۔

''یار ہوتے ہیں رنڈیوں کے۔ اپن کو چاچا کہہ کے بُلانا۔ سب یہی بولتے ہیں۔ جھمرّو چاچا۔''

چندو تھوک نگل کے چُپ ہو گیا۔ جھمرّو بولا۔

''دیوا پھر آئے گا۔ ہفتے کی اٹھنی لیتا ہے یہاں سونے کی۔''

چندو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

Scanned by CamScanner

''یہ ہلدی ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ مرچی بنو۔ لال مرچی!''

جھمرُو پھر بولا۔

''چل چوپاٹی پہ بھاشن ہے آج۔ پانچ روپیہ ملے گا۔''

''کرنا کیا ہوگا؟''

''بھاشن سُننا پڑے گا۔ تالی بجانی ہوگی۔ اور ''جے ہو'' بولنا پڑے گا۔''

چندو مُسکرایا۔

''اِس کے لئے پانچ روپے ملیں گے؟''

''ہاں! پن ففٹی پرسینٹ اپن کا ہوگا۔ دیکھ پارٹی (پالٹی) سے دس روپیہ ملتا ہے۔ دیوا پانچ کاٹ کے، پانچ اپن کو دیتا ہے۔ اپنے فُٹ پاتھ سے اُس کو پچاس آدمی کا آرڈر ملا ہے۔ میرے کو جُگاڑ کرنا ہے۔ سمجھا؟''

چندو نے سر ہلا دیا۔

''ہو!'' مراٹھی کا پہلا شبد اُس نے یہی سیکھا تھا۔

ایک بار پھر چندو کو وہی لگا۔ عجیب شہر ہے! پالتا بھی ہے۔ کاٹتا بھی ہے۔

جھمرُو نے کہا:

''اپن سب کو مڑی کے مافق ہے۔''

''کو مڑی کیا؟''

''مُرغی۔ یہ نگر سب کو دانہ پھینکتا ہے۔ ہم لوگ کو مڑی کے مافق ٹک ٹک چگتے رہتے ہیں۔ پھر جب کو مڑی پل جاتی ہے تو اُس کو کاٹ دیتا ہے۔''

''کون کاٹتا ہے؟''

Scanned by CamScanner

''راجا لوگ!''

''راجا کون ہے؟''

''اِدھر دو قسم کا لوگ راج کرتا ہے۔ ایک تو پارٹی والا ہے۔ بات کرتا ہے۔ بھاشن دیتا ہے۔ نوٹ دیتا ہے۔ ووٹ لیتا ہے! دُوسرا گولی چاقو چلانے والا ہے۔ مال دیتا ہے، جان دیتا ہے۔ کبھی جان لیتا ہے، مال دیتا ہے!''

''تُمہارا مطلب غُنڈے لوگ!''

''غُنڈے تو دونوں ہی سچ ہیں۔ لیکن دونوں کا اِسٹائل الگ الگ ہے!''

چندو کو مہانگر کے طریقے سیکھتے وقت نہیں لگا۔

اگلی بار دیوا کے ساتھ ایک پارٹی والا آدمی آیا تھا۔ اُس نے آدمی گِنے اور پُوچھا۔

''نیتا جی بولیں گے، 'ممبئی کونڑاچی' تم لوگ کیا بولو گے؟''

سب نے ایک آواز ہو کر کہا:

''ممبئی آچی!''

''اے مدراسی... مراٹھی میں بولنے کا۔ تامل میں نہیں۔ کیا بولے گا؟''

''ممبئی آچی!!''

''گڈ!''

وہ چلا گیا تو چندو نے دیوا سے پوچھا۔

''بھاؤ!''

اُس نے دوسروں کو سُنا تھا دیوا کو اِس نام سے بُلاتے۔ اُس کا چہرہ فوراً نرم

Scanned by CamScanner

پڑ جاتا تھا۔

''بھاؤ... اِس پارٹی والے کو کتنا پیسہ ملتا ہوگا، ایک آدمی بُلانے کا؟''

دیوا کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''تیرے کو کیا؟... تجھے پانچ اٹھنی ملا نہ؟''

''پانچ اٹھنی سے کیا ہوتا ہے بھاؤ؟''

''پانچ ہفتے سونے کا بھاڑا ہوگیا نا؟''

''سونے کا ہوگیا۔ کھانے کا کیا کروں بھاؤ؟''

''کیا ہم بُلایا تھا تیرے کو؟ کون سے یُوپی سے آیا بولا؟''

''فیض آباد۔''

''پھیچ آباد میں کون دیتا تھا کھانے کو؟ کیا؟... بول؟''

چندو نے اتنا بڑا جھوٹ بولا کہ وہ خود ہی ہل گیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے۔

''ہ... ہہ... ہم لوگ کھیتوں میں مزدور تھے۔ وہ کچھ ٹیریرسٹ لوگ آئے اور تاڑ تاڑ گولیوں سے سب کو بھون دیا۔ میری پوری فیملی ماں باپ بھائی بچے سب.....''

اُس سے آگے وہ کہانی نہیں بنا پایا۔ کانپنے لگا۔ لیکن بھاؤ کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ اُس نے سمجھا سچ بول رہا ہے۔

''میں دیکھتا ہوں۔ کوئی کام لگاتا ہوں تیرے کو۔ کچھ لکھنا پڑھنا آتا ہے؟''

''ہندی کی تین جماعت پڑھا ہوں گاؤں میں۔''

''اپنا نام لکھ لیتا ہے؟''

''ہو!''

Scanned by CamScanner

''میرا بھی لکھ سکتا ہے؟''

''ہو!!''

''کل سے میرے ساتھ چل۔ میرے کو ہفتے کا ڈائری بھرنا ہوتا ہے۔ اپنی ہندی اچھی نہیں۔ راشٹری بھاشا ہے نا۔ کیا کرنے کا۔ لکھنا پڑتا ہے۔ وہی بول کے نوکری ملا تھا۔ وہ سالا..... ایک ہے چار اٹھنی لیتا ہے، بھر کے دینے کا۔ اِس نگر میں کوئی کام پھوکٹ میں نہیں ہوتا۔ کیا؟''

چندو کا کام بن گیا۔ مگر اُس نے پوچھا:

''بھاؤ تم سارا حساب اٹھنیوں میں کیوں رکھتے ہو؟''

بھاؤ آدھا ہنس کے بولا:

''اپنے جیسے 'کومن مین' کے پاس سب کچھ آدھا ہی چ ہوتا ہے۔ آدھا کھانا، آدھا سونا، آدھا ہنسنا، آدھا رونا، آدھا جینا، آدھا چ مرنا _____ یہ اٹھنی سالا کبھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔''

پھر رُک کے بولا:

''ہے نا اوپر کی بات؟ _____ اپن کو ایک (hushed tone) نیکسلائٹ بولا تھا۔''

چندو بھاؤ کے ساتھ رپورٹر کی طرح جانے لگا۔ وہ جو بھی کرتا تھا۔ چندو سے کہتا تھا، 'لکھ لے'!

چندو، بھاؤ کی کھولی میں ہی رہنے لگا۔ کبھی کبھی کھانا بنا کر پہنچ جاتا۔ جہاں بھی

Scanned by CamScanner

ڈیوٹی ہوتی۔

بائیکلہ کے نیچے وہ 'ساروی' ہوٹل کے پیچھے سے نکلتی ہوئی ایک گلی ہے، اُس پر ایک آدمی خونچہ لگاتا تھا۔ لائسینس نہیں تھا۔ بڑا اُردو جیسا لگتا تھا۔ بھاؤ پہنچ گیا ایک دن، ڈائری نکالی اور پوچھا:

''کیا بیچتے ہو تم؟''

وہ خاص لکھنوی لہجے میں بولا:

''خمیرے کی گلقند یاں!''

بھاؤ چونک گیا۔

''کیا؟''

''خمیرے کی گُلقند یاں، صاحب!''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''کھا کے دیکھئے۔''

''ہوں۔ اپن چانا ؤ کائے؟'' وہ مراٹھی میں بولا: ''نام کیا ہے؟''

''اسحاق الرحمان صدیقی!''

بھاؤ نے زور سے کہا۔

''ہندی میں بول، ہندی میں۔''

اُس نے دوہرایا۔

''اسحاق الرحمان صدیقی!''

بھاؤ نے لمبی سانس لی، پینسل ڈائری پر رکھی اور پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''چھوٹی 'اِی' کہ بڑی 'اِی' ؟''

''وہ کیا ہے صاحب؟''

بھاؤ نے ڈائری بند کی اور بولا:

''دیکھ میں چھوڑ دیتا ہے تیرے کو! لیکن رپورٹ میں یہ نہیں چلے گا۔ رپورٹ میں تُو بابُو ہے، اور آلو بیچتا ہے۔ کیا؟''

اتنے میں چندو پہنچ گیا۔ بھاؤ بولا۔

''لکھ لے۔ نام ہے بابو، بیچتا ہے آلو...! چندو چار اٹھنی رکھوا لے۔''

اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ لیا۔

ایک بار پھر کچھ ایسا ہی ہوا۔ چندو کو بخار تھا وہ گیا نہیں۔ بھاؤ نے آ کے بتایا۔

''وہ ہے نا... ونائیک راؤ چار استہ۔''

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دیوا کی تبدیلی، وارڈن روڈ کی طرف ہو چکی تھی۔ اور کھولی اب ورلی میں تھی۔ چندو نے پھر پوچھا۔

''ہاں تو ونائیک راؤ مارگ پر کیا ہوا؟'' چندو کو سب راستوں کے نام یاد تھے۔

''ایک گائے مر گئی۔''

''کس کی تھی؟''

''پتہ نہیں۔ وہ جو گائے لوگ روڈ پر اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں پریوار کے ساتھ۔ اُس کو بھی اُسی روڈ پر آ کر مرنا تھا سالا۔ اتنا بڑا نام.... ونائیک راؤ پٹوردھن مارگ! کون لکھتا؟ ہندی میں؟''

چندو ہنس پڑا۔

Scanned by CamScanner

''پھر کیا کیا؟''

''دو گھنٹہ لگا۔ دُم سے کھینچ کھینچ کے، کھینچ کھینچ کے، دَم نکل گیا سالا... دو گھنٹے لگے... دو گھنٹے میں لے جا کے سامنے والی روڈ پر ڈالا۔''

''وہاں کیوں؟''

''باپو روڈ! اور لکھ دیا۔''

''اٹھنی کس نے دی؟''

''جس کے دروازے پر مری تھی۔''

بھاؤ اور چندو کی دوستی اب کئی سال پُرانی ہوگئی تھی۔ اِس بیچ میں بھاؤ نے کئی جگہ اُسے کام پر لگایا، اور کئی جگہ چھڑایا۔ اور پھر ایک بار، ایک پارٹی والے سے کہہ کے، ایک منسٹر کے اُدھر چوکیدار لگوا دیا۔

چندو اب پُورا ممبئی والا بن چُکا تھا۔ منسٹر صاحب کو بھی بہت بھروسہ تھا اُس پر۔ اپنے نجی کام بھی اُسی کو دیتے تھے۔ بریف کیس پہنچانا اور بریف کیس لانا۔ اب اُسی کا کام تھا۔ اُس نے اٹھنیوں میں گننا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بیچ بیچ میں اٹھنیوں کا لین دین چلتا رہتا۔

ایک دن ایک بڑا دھماکہ ہوا۔ بنگلے پر!

منسٹر صاحب دفتر میں تھے۔ چونک کر کھڑے ہوگئے۔ اُس کے ساتھ ہی دھاڑ سے چندو آ کے گرا فرش پر۔ اُس کے پیچھے ایک بندوق والا، AK - 47 لئے کھڑا تھا۔

''کیا...؟ کیا...؟ یہ کیا ہے؟''

Scanned by CamScanner

اور ڈانٹ کے بولے۔

''چندو!! اندر کیوں آنے دیا اِسے؟''

''میں کہاں... صاحب۔ یہ مجھے لے کر اندر آ گیا۔''

وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بندوق کی نوک پر۔

''کون ہو بھئی تم؟'' منسٹر کی آواز بندوق دیکھ کر نرم پڑنے لگی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''تم تو... کوئی ٹیریرسٹ لگتے ہو بھئی!''

ٹیریرسٹ مُسکرایا۔ منسٹر بھی مُسکرا دیا۔

''اِسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟'' منسٹر نے چندو کی طرف اِشارہ کیا۔

''یہ میرا 'ہوسٹیج' ہے۔''

منسٹر نے بھی مذاق کیا۔

''میرا بھی وہی ہے!... 'ہوسٹیج'!''

''کب سے؟... یہ تو باہر گھوم رہا تھا۔''

''مجھے تمہاری طرح بندوق نہیں دکھانی پڑتی۔ ہوسٹیج بنانے کے لئے۔''

''تو کیسے پکڑ کے رکھتے ہو؟''

''پہلے نوٹ سے، پھر ووٹ سے۔ پانچ سال کے لئے!''

''اور پھر...؟''

''ہر پانچ سال کے بعد ہم میعاد renew کر دیتے ہیں۔''

ٹیریرسٹ نے پینترا بدلا۔ بندوق سنبھالی اور بولا:

Scanned by CamScanner

''یہ Leave and License کا سسٹم اب نہیں چلے گا۔''

''تو کیا چلے گا؟''

''اِسی سے پوچھو۔ میرے تمہارے بیچ یہی کومن ہے۔ کومن مین!!''

منسٹر نے چندو سے پوچھا۔

''بولو_____ ایک بار گولی کھا کے مرنا اچھا لگتا ہے تمہیں؟...یا.....''

ٹیریرسٹ ذرا سا سامنے آیا۔

''...یا.....تِل تِل کر کے.....ہر پانچ پانچ سال میں مرنا اچھا لگتا ہے؟....''

چندو رُکا ذرا سا، دونوں کو دیکھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔

ٹیریرسٹ نے دھمکا کے پوچھا:

''کیا ہے جیب میں؟''

چندو نے آرام سے جواب دیا۔

''کچھ نہیں ایک اٹھنّی ہے۔ ٹوس (Toss) کر کے دیکھتا ہوں۔''

ایک قدم آگے بڑھا۔ اور جیسے ہی اٹھنّی اُچھالی، وہ دونوں چلائے۔

''ہیڈ!!''

شکر ہے وہ اٹھنّی واپس نہیں آئی۔ ورنہ... اُس کے دونوں طرف چندو کا ہیڈ تھا!

Scanned by CamScanner

بڑا ہونے لگا تھا، پھر خیال آیا ____

مَیں پوچھوں تو سہی، کتنا ضروری ہے بڑا ہونا ____ !

Scanned by CamScanner

گاگی اور سُپر مین

'سُپر مین' کے وِڈیو کیسیٹ اور کومک بُکس کا ڈھیر لگ گیا تھا میرے گھر پہ۔ شروع شروع میں تو اُن کی ڈھیریاں صرف بچّوں کے کمرے ہی میں نظر آتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ، سَرک سَرک کے میرے بُک شیلف میں بھی سرایت کرنے لگیں۔ ایک کتاب نکالوں تو دو تین سُپر مین نیچے آ پڑتے۔ تھوڑی دیر اُلجھن ہوتی اور پھر میں بھی کہیں نہ کہیں، کتابوں کے پیچھے ہی دھکیل دیتا اُنہیں۔ دو تین بار یہ بھی ہُوا کہ میں نے اُومی سے کہا۔

''یہ سب نکال کے ردّی میں کیوں نہیں بیچ دیتیں؟''

''ممی نو___!'' بچّی پتہ نہیں کہاں سے نِکل آئی۔ اُس کے ہاتھ میں اُس وقت بھی ایک سُپر مین بُک تھی۔ انگریزی میں بولی:

''پاپا۔ ہاؤ کین یُو؟___ سُو پر مین اِز سُو پر مین! آپ اپنی تھوڑی سی کتابیں بیچ دو نا۔ سُو پر مین کو بھی تو جگہ چاہیئے۔'' اُومی ہنس کے واپس چلی گئی۔ یہ کہتے ہُوئے۔

''ابھی تو وِڈیو آنے باقی ہیں۔ اِن کا کمرہ بھر چُکا ہے!''

Scanned by CamScanner

''لیکن اِتنے سارے آتے کہاں سے ہیں؟''

''گاگی لاتی ہے!''

گاگی میری بیٹی کی ہم عُمر تھی، ہم جماعت بھی۔ لیکن سکول الگ الگ تھے۔ آدھی سے تھوڑا کم میرے گھر میں پَلی تھی۔ اور باقی اپنے ماں باپ کے ساتھ۔ وِکاس ڈیسائی اور اروناراجے۔ وہ گیارہ برس زندہ رہی۔

دن رات بس یہی کام تھا ان بچّوں کا۔ ٹی۔ وی پر سُپر مین دیکھنا اور سُپر مین کو مِک بُکس پڑھنا منع کرتے تو فوراً اپنی مارکس شیٹ دِکھا دیتے۔ یہ تینوں چاروں بچّے، سبھی اوّل رہتے تھے اپنی کلاس میں۔ صرف پڑھائی میں ہی نہیں۔ ہر کام میں۔

ایک دن بہت تنگ آیا، تو میں نے سب کو ڈانٹ دیا۔ گاگی بولی:

''انکل، سُوپر مین از لائک گوڈ! گوڈ کے جیسے وہ بھی سب کُچھ کر سکتا ہے!''

بڑی حاضر جواب تھی گاگی۔

نو برس کی تھی جب پتہ چلا تھا، اُسے کینسر ہے۔ بون کینسر! گُگی، اور بُنچکی! گُگی باسو کی بیٹی تھی۔ فلمکار ہونے کی وجہ سے ہم لوگ اکثر ملتے رہتے تھے۔ اور اِس لئے ہمارے بچّوں کا کسی ایک گھر میں جمع ہو جانا سوبھاوک ہو گیا۔ میری وائف کیونکہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ اِس لئے میرے ہاں سب بچّے زیادہ آزاد محسوس کرتے تھے۔ زیادہ تر اڈّے یہیں جمتے تھے۔

بنگلور میں ایک بار ایک ساتھ تھے ہم۔ وکاس کو سوِمنگ کا بہت شوق تھا۔ اُس کا

Scanned by CamScanner

زیادہ وقت سومنگ پول ہی میں گذرتا تھا۔ وہیں بچّوں کو سومنگ کی مشق بھی کراتا، اور اُن کے ساتھ پانی کے کھیل کھیلتا رہتا تھا۔ جسامت سے ذرا بھاری تھا وہ۔ گاگی نے ایک بار کہا:

''پاپا، آپ اتنے موٹے ہیں۔ پانی میں ڈوبتے کیوں نہیں؟''

''پانی میں بڑی طاقت ہے بیٹا۔ بڑے بڑے جہاز بھی اُٹھا لیتا ہے۔''

''میری گھڑی تو ڈوب گئی تھی!''

وکاس نے لاجواب ہو کر ارونا کی طرف دیکھا۔ ارونا کی ہنسی چھوٹ گئی اور دیر تک ہنستی رہی۔ وکاس کھسیانہ محسوس کرنے لگا تو ہم اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ وکاس جب گاگی کو لے کر آیا تو وہ تھوڑا تھوڑا لنگڑا رہی تھی۔ سب سے پہلی علامت گاگی کے پیر سے واضع ہُوئی۔ جب گاگی کو چلنے میں تکلیف ہُوئی تو اُس کے پیر کا علاج شُروع ہُوا۔ کئی طرح کے جُوتے بدلے اور بنوائے گئے۔ لیکن اُسکے پاؤں کا درد نہیں گیا۔ 'کتھک' سیکھنے کا بہت شوق تھا اُسے۔ وہ بند ہو گیا۔ لیکن مُنہ زبانی توڑے بہت بولتی تھی۔ گاڑی کی طرف بھاگتے ہُوئے، سیڑھیاں اُترتے ہُوئے۔ ''ترکٹ تا تھئی تھئی..... ترکٹ تا تھئی تھئی.....''

سنگیت یُوں بھی اُن کے گھرانے میں تھا۔ چھوٹے دادا سنگیت کار تھے۔ وسنت ڈیسائی۔

جب ٹانگ کا درد مسلسل رہنے لگا، تو سکول کے معمول میں بھی وقفے آنے لگے۔ گاگی کبھی کبھی کتھک کلاس کی خواہش ظاہر کرتی تھی۔ اِس لئے ارونا نے گھر پر ایک ڈانس ماسٹر کا انتظام کر دیا۔ لیکن گاگی اپنے پاؤں سے، بھاری گھنگھرو پہن کے، چلنے کا لُطف لیتی تھی۔ ناچ نہیں پاتی تھی۔

Scanned by CamScanner

پہلی بار ڈاکٹر ادھیکاری کو شک ہُوا کہ تکلیف پیر میں، یا ٹخنوں میں نہیں، پنڈلی کی ہڈّی میں ہے۔ ایکسرے سے بھی کچھ پتہ نہیں چلا، تو دُوسرے ٹیسٹ شروع ہو گئے۔ وکاس اپنے چچا وسنت ڈیسائی کے ہاں شفٹ کر گیا، جن کا گھر ''جسلوک'' ہسپتال کے بالکل سامنے تھا۔ پیڈر روڈ پر۔

ادھیکاری کو شک تو ہو گیا تھا، لیکن دو تین مہینے تک وہ اپنی اُمید کے ٹیسٹ لیتا رہا۔ آخر ایک دن اُس نے رپورٹ دونوں کے سامنے رکھ دی۔ گاگی باہر کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ارونا اور وکاس، سنائے ہُوئے اندر بیٹھے رہے۔ گاگی کا کینسر ثابت ہو چُکا تھا۔

جب اُٹھے تو دونوں نے قسم کھائی کہ گاگی کے سامنے روئیں گے نہیں۔ کبھی نہیں! ___ اکیلے میں کون کتنا رویا ہے، پتہ نہیں، لیکن سچ ہے کہ ہم نے اُنہیں باقی دو سال، اِس لیے کو بڑی زندہ دِلی سے لڑتے دیکھا۔ گاگی کی عُمر اُس وقت نو برس کی تھی۔

پُرانے دوست، نئی سہلیاں، آنٹیاں، اور انکل اور کھیل، اور وڈیو، اور بندر والا، اور بھالُو والا ___ کیا کچھ نہیں ہُوا گاگی کے کمرے میں۔ گاگی کو کچھ سوچنے کا وقت نہیں دِیا گیا۔ وکاس اور ارونا نے ہسپتال کی سنجیدگی، گھر تک نہیں آنے دی۔ مُجھے تو حیرت ہوتی تھی اُن دونوں کے حوصلوں پر۔ گاگی اُن دِنوں ''انتا کشری'' میں ایکسپرٹ ہو گئی تھی۔ جب باقی علاج ہار گئے اور بات آپریشن پر آ کر رُک گئی ___ تو گاگی کو امریکہ لے جایا گیا۔ اب گاگی جانتی تھی، اُسے کینسر ہو گیا ہے۔

''لیکن پیر میں کیوں پاپا؟''

''بون کینسر ہے بیٹا۔ ٹانگ کی ہڈّی ہے۔ آپریشن سے ٹھیک ہو جائے گا۔ پھیلنے

Scanned by CamScanner

سے پہلے اُسے کرید کے نکال دیں گے۔"

امریکہ میں کئی مہینہ علاج چلا۔ 'کیمیو تھیراپی' کی وجہ سے گاگی کے سارے بال چلے گئے۔ وہ اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کے ڈر جاتی تھی۔ اور ڈری ڈری آنکھوں سے ماں باپ کی طرف دیکھتی، تو وہ ہنس کے کہتے تھے۔

"گنجو ___ ! دو مہینے بعد پھر بال آ جائیں گے تیرے!"

"بھئی، مُجھے تو گنجی اچھی لگتی ہے۔ یہی تو نیا سٹائل ہے۔"

"ہائے یُل برنر (Yule Brinier)"

میرا خیال ہے گاگی کو ماں باپ کی ہنسی پر بہت یقین تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹروں نے بھی یہی اُمید دِلائی تھی، جب اُس کی ٹانگ پر پلاسٹر باندھ کر واپس بھیجا تھا۔

امریکہ سے واپس آنے کے بعد، کچھ ہی دِنوں میں اُس کی ٹانگ سے سڑاند آنے لگی۔ بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ادھیکاری کے بجائے، اِس بار کوئی اور ڈاکٹر آیا۔ اُس نے فوراً پلاسٹر کھلوا دیا۔ ٹانگ میں جگہ جگہ زخم ہو گئے تھے۔ سب کہتے تھے کینسر تو نہیں ہے۔ لیکن علاج بھی کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ ڈاکٹر دوائیوں کی طرح بدلنے لگے۔ تین مہینے کے اندر اندر، اس ڈر سے کہ کہیں پھر کینسر نہ اُگنے لگے، گاگی کی دائیں ٹانگ کاٹ دی گئی ___ اور اُسے کتھک، بجلی کے 'کریمٹوریم' (Crematorium) میں لے جا کر، جلا دیا گیا۔ باقاعدہ مُردے کی رسومات کے ساتھ!

گاگی کی نظر چھت سے نیچے اُتری تو اُس نے بڑی چُپ سی آواز میں پُوچھا: "پاپا، گوڈ مُجھے کیوں پنش (punish) کر رہا ہے؟ میں نے تو کُچھ کیا بھی نہیں!"

Scanned by CamScanner

ارونا نے اُنہیں دِنوں میں، کرشن کی مُورتی کمرے میں لا کے رکھ دی تھی۔ دُھوپ جلاتی تھی اور دن رات دِیا جلتا رہتا تھا اُس کے سامنے۔ پرائشچت کے طور پر ماس مچھی کھانا، سب چھوڑ دِیا___ حالانکہ گاگی، کبھی کبھی کباب یا تِکا مانگ لیتی تو کبھی منع نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر سے پُوچھ بھی لیا تھا۔ اُس نے اجازت بھی دے دی تھی۔

ایک روز جب نیا ڈاکٹر داخل ہُوا تو گاگی نے پُوچھا تھا۔

''پھر ڈاکٹر بدل لئے پاپا؟''

''ہاں بیٹا۔ اُس ڈاکٹر سے کُچھ نہیں ہو سکا۔''

ایک ذرا سے وقفے کے ساتھ پُوچھا گاگی نے:

''اس گاڈ سے بھی تو کُچھ نہیں ہُوا، پاپا۔ اور کوئی گاڈ نہیں ہے؟''

ارونا جیسی بات تو نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیوں اُس کے مُنہ سے نِکلا۔

''وہ سُپر مین کے جیسا ہی ہے بیٹا۔ کتابوں میں سب کُچھ کر لیتا ہے!!''

گھگُو اور جامنی

گھگُو، سرُو کی شاخوں میں چھپ کر روز اُس پتنگ کا انتظار کیا کرتا تھا، جو باغ کے اُس طرف سے اُڑتی تھی اور دیر تک جھومتی تھی آسمان میں! اُسے پریم ہوگیا تھا اُس پتنگ سے! ہر روز وہی پیلا اور جامنی رنگ! کبھی اِس لَے، کبھی اُس تال! وہ سچ مُچ اُسے کوئی پرندہ ہی سمجھتا تھا۔

بہت بار وہ اُڑ کر اُس کے پاس سے گذرا، اور اپنی زبان میں کہا بھی:

''تُمہارے دونوں پنکھوں کے رنگ الگ الگ ہیں۔ ایک پیلا، ایک جامنی۔ تُم بہت خوبصورت ہو۔''

اور ہر بار وہ خم کھا کر نیچے کی طرف اُتر جاتی۔ اور وہ سمجھتا شرما گئی ہے۔ ایک بار اُس نے اپنے گھونسلے میں چلنے کی دعوت بھی دی۔ لیکن وہ اِٹھلاتی ہُوئی اُوپر اُٹھ گئی۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ جب بھی وہ پاس جاتا وہ ہٹ جاتی۔ اُس نے دُور ہی سے کہا۔

''جب اس طرح اِتراتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔''

Scanned by CamScanner

پھر بھی اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُس کی آواز سُننے کو ترستا رہا۔ گھگو کو دن میں کئی بار اُس کی یاد آجاتی۔ اور وہ دیر تک باغ کے اُس طرف منڈلاتا رہتا، جس طرف سے وہ آیا کرتی تھی۔ شاید کسی پیڑ یا کسی چھت پر نظر آجائے۔ کئی بار تو وہ اپنا دانہ چگنا بھی بھول جاتا۔ اور کبھی کوئی اچھا ٹکڑہ خوراک کا مل جاتا تو چونچ میں لئے اُڑتا رہتا، وہ ملے تو اُسے کھلائے گا۔ کچھ اچھے اچھے تنکے اور تاگے اُس نے جمع کر لئے تھے۔ ایک گھونسلہ سجانا شروع کر دیا تھا۔ اُسے گھر لانے کے لئے۔ سبھی نر پنچھی اپنی مادہ کے لئے گھر بنایا کرتے ہیں۔ وہ اُن سب سے اچھا بنائے گا۔

بہت دِنوں بعد اُسے پتہ چلا کہ وہ قیدی ہے۔ اور اُس کی پیٹھ پر، بڑی تیز چمکتی ہُوئی ایک ڈور بندھی ہے۔ دھاگے کی طرح پتلی اور مہین! گھگو کا پنکھ ایک بار ٹکرایا تو بس کٹ ہی گیا تھا۔ ایک دو پَر بھی گر گئے تھے۔ تب اُسے سمجھ آیا وہ اُس کی طرح آزاد نہیں ہے۔ اُس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اِسی لئے شاید، مالک کے ڈر سے آواز نہیں کرتی۔ وہ روز تھوڑی دیر کے لئے اُسے آسمان میں اُڑنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن جب بھی کوئی پرندہ اُس کے پاس پہنچے تو وہ کھینچ کے، واپس اپنی چھت پر اُتار لیتا ہے۔ اور کان سے پکڑ کے پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ کان سے پکڑتے تو اُس نے دیکھا تھا لیکن پنجرہ پتہ نہیں کہاں رکھتا تھا۔ جانتا تو وہ ضرور وہاں تک جاتا اور اُسے آزاد کرانے کی کوشش کرتا۔

ایک روز ویسے ہی گھگو، سرُو کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھا تھا کہ دیکھا گھٹائیں آہستہ آہستہ جمع ہو کر اُوپر اُٹھ رہی ہیں۔ اُسے معلوم تھا، گھٹائیں، برسنے سے پہلے پیٹ کی ہوائیں نکال دیتی ہیں۔ ایسی ہوا میں تو کاگ بھی نہیں اُڑ پاتے۔ ایک نازک سی جامنی بیچاری کیا اُڑے گی۔ وہ ابھی ابھی گھر سے نکلی تھی۔ آسمان میں اپنا 'توازن' ڈھونڈ رہی تھی

Scanned by CamScanner

کہ ہوا کے جھونکے تیز ہونے لگے۔ گھگو بے اختیار اُڑا، پتنگ کو خبردار کرنے۔ اُسی میں وہ ایک تیز جھونکے کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ بہت دُور تھا، لیکن چلاّ تا رہا۔

''جاؤ..... جامنی واپس جاؤ۔''

اُس نے خود ہی ایک نام بھی رکھ لیا تھا اُس کا۔

''جاؤ.... واپس گھر جاؤ..... بہت تیز آندھی آنے والی ہے اور بارش میں تُم.....''

اُس کے گلے میں کُچھ پھنس گیا، اور ہوا اُسے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ دِکھائی بھی کم دے رہا تھا۔ لیکن اُسے اندازہ تھا، پتنگ کا گھر کس طرف ہے۔ گھٹائیں پاس آ رہی تھیں اور آندھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک اُس کا توازن بگڑا۔ وہ کئی فُٹ نیچے گرا اور ایک کھمبے سے ٹکرا کے بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا، تو وہ کسی لکڑی کی الماری میں، اور کُچھ نرم کپڑوں پر رکھا ہُوا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کی سیلن اور بارش کی آواز سے اُسے پتہ چل گیا تھا۔ ایک عجیب سی بُو، اُس کے جسم سے آ رہی تھی۔ جیسی ہسپتال کے روشندان سے آیا کرتی ہے۔ کُچھ بچّوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ اُسے سب یاد آ گیا۔ سمجھ گیا، کھمبے سے ٹکرا کے وہ سڑک پر گرا ہوگا۔ مرا نہیں۔ کوئی بچّہ اُٹھا لایا ہے، جو اُس کی تیمارداری کر رہا ہے۔ آنکھیں بند کر کے وہ من ہی من اپنا درد سہلاتا رہا اور یاد کرتا رہا پتنگ کو۔ پتہ نہیں، بیچاری وقت پر گھر پہنچی کہ نہیں۔ کہیں آندھی کی لپیٹ میں تو نہیں آ گئی.... مر نہ گئی ہو۔

کئی دن بعد جب اُسے ایک پنجرے میں ڈال کے بالکنی میں لٹکایا گیا تو اُسے اچھا لگا۔ پَروں کی طاقت دھیرے دھیرے واپس آ رہی تھی۔ زور سے پھڑ پھڑا نہیں پاتا تھا۔ کندھے میں تھوڑا تھوڑا درد باقی تھا۔ ایک دو دن کے بعد، جب دُوسرے پنچھیوں کی

Scanned by CamScanner

آوازیں پہچان میں آئیں تو اور بھی اچھا لگا۔ وہ اپنے ہی علاقے میں تھا۔ باغ کے اُسی طرف جہاں سے پتنگ اُڑا کرتی تھی۔ ایک اُمید نے پھر سے جینے کی طاقت دے دی اُسے۔

کئی دن انتظار میں کٹے۔ آپ ہی آپ باتیں کرتا۔ اُسے آوازیں دیتا۔

''سُنو جامنی..... میں کُچھ دن یہیں پر ہُوں۔ کُچھ بچّوں کے پاس۔ نیچے ایک بلڈنگ میں، مونٹو کے گھر پہ۔ آسمان میں مت ڈھونڈنا مُجھے۔..... تُم کیسی ہو ؟..... کہاں پر ہو ؟''

آخر ایک دن پیلی جامنی پتنگ اُسے نظر آ ہی گئی۔ اُس کی حالت غیر ہوگئی۔ پھڑ پھڑا کے اُس نے اپنے کندھے پھر زخمی کر لئے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا جو اُسے کھول دیتا۔ اُس کا پنجرہ جھولتا رہا۔ وہ بہت چلّایا، لیکن جامنی نے نیچے دیکھا ہی نہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے جامنی، اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ اور پھر جب نظر آئی تو وہ بے سُدھ سی، ڈولتی ڈولتی بازار کی طرف آ رہی تھی۔ اُس کی ڈور اُس کے پیچھے لٹک رہی تھی۔ شاید اُس کو ڈھونڈ رہی ہو۔ وہ قید سے ڈور تڑا کے بھاگ آئی ہوگی۔ اُسی کے لئے۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے اُتر رہی تھی۔ اور کُچھ بچّے اُسے دیکھ کے اُس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گھگّو نے آوازیں تو بہت دیں، لیکن کوئی آواز اُس تک پہنچی نہیں۔ بچّوں کے شور وغُل اور ٹریفک میں اُس کی آواز بہت کمزور پڑ گئی۔

اچانک ایک بڑے سے لڑکے نے، اُس کی ڈور پکڑ لی، اور سامنے کی پتلی سی ایک گلی میں بھاگ لیا۔ اُس نے دیکھا، جامنی چھڑانے کے لئے اُوپر اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بچّے کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ چھڑا نہیں پائی۔

Scanned by CamScanner

اور پھر وہ ہُوا جو گھنّو نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ گھنّو کی تو سانس ہی رُک گئی جب، مونٹو اُسے لہراتا ہُوا گھر میں داخل ہُوا۔

''ماں.... ماں.... گڈّی..... گڈّی ملی۔

جامنی کا اصلی نام گڈّی تھا۔ اُسے اب پتہ چلا۔ سب نے پیار سے اُٹھا کے دیکھا اُسے۔ مونٹو نے اُسی بالکنی میں دیوار پہ لٹکا دیا۔ جس بالکنی میں گھنّو کا پنجرہ لٹکا تھا۔

ساری رات وہ اُسے بُلاتا رہا۔

''جامنی.... گڈّی.... جامنی۔''

مگر وہ بولتی نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہوا سے ہلتی تھی بس۔ گھنّو سمجھ گیا۔ وہ گُونگی تھی ..... اِس لئے !..... وہ کبھی بولی نہیں.....!!

Scanned by CamScanner

نارنگی

ماموں کا کہانی سُنانے کا اسٹائل کمال تھا۔ بات کرتے کرتے کہانی شُروع کر دیتے تھے۔اور کہانی بتاتے بتاتے بات کرنے لگتے تھے۔

''تو شروع شروع میں جب باہر کی دُنیاؤں سے سپیس کرافٹ آئے، ہمارے سولر سسٹم کو سٹڈی (مطالعہ) کرنے تو اُنہیں یہ گول زمین بالکل ایک تازہ نارنگی کی طرح دِکھائی دی..... لیکن نیلے اور سبز رنگ کی نارنگی۔''

امجد کا دھیان پھر اپنی نارنگی پر چلا گیا۔

دو دن، یا تین دن پہلے کی بات ہے، گھر میں سنترے آئے جنہیں امّی اور ماموں نارنگی کہتے ہیں۔ سب کو اپنے اپنے حصّے کی ایک ایک نارنگی بانٹ دی گئی۔ امجد کو منع کر دیا گیا، کیوں کہ اُسے زکام تھا اور ہلکا ہلکا بُخار بھی.... امجد نے ضِد کی تو امّی نے اُس کی نارنگی، اُس کے پاس رکھ دی اور کہا:

Scanned by CamScanner

''ابھی کھانا مت۔ جب تک زکام ہے اسے یہیں پڑی رہنے دو۔''

امجد کو تسلی تو تھی کہ اُسے اُس کے حصّے سے محروم نہیں کیا گیا۔ لیکن دو دن پہلے جتنی خوشنما اور چمکدار تھی، وہ اب کُچھ کُچھ کم ہونے لگی تھی۔

ماموں اپنی نارنگی کی بات کر رہے تھے۔

''نیلے سبز رنگ سے دُوسری دُنیا والوں کو اندازہ ہُوا کہ اس زمین کے گرد دو تہائی سے زیادہ، پانی کے سمندر ہیں۔ بلکہ اُسی رنگ کی کُچھ دھاریاں زمین کے حصّے پر بھی نظر آئیں۔ جیسے سمندر سے نکل کے پانی اُن میں بہہ رہا ہو۔ دریاؤں میں....''

''لیکن ماموں، وہ اُلٹا ہے۔ دریاؤں کا پانی سمندر میں جاتا ہے نہ کہ....''

''ارے بھائی اتنے اُوپر سے بہاؤ تھوڑا ہی پتہ چلتا ہوگا؟ ایسے ہی لگا جیسے زمین کے جسم پر رگیں بچھی ہُوں۔ ایسی.....''

ماموں نے اپنی بانہہ کھول کے موٹی موٹی رگیں دِکھائیں۔ امجد کو اپنی نارنگی پر تو ایسی رگیں نظر نہیں آئیں۔ بلکہ تازہ شگفتہ نارنگی اب کُچھ کُچھ پلپلی ہونے لگی تھی۔ اور کہیں کہیں کُچھ داغ نظر آنے لگے تھے۔ جیسے بوڑھے پھُوپھا کے چہرے پر۔

ماموں کی کہانی کئی کئی دن چلتی تھی۔ وہ اپنی کہانی جاری رکھنے سے باز نہیں آئے۔ کُچھ دن نہیں، وہ کُچھ صدیاں آگے نکل گئے۔

''جیسے جیسے، سپیس کرافٹ، کئی کئی صدیوں کے بعد آتے رہے، نارنگی کی حالت بچکتی گئی۔ اُن لوگوں نے زمین کے اور قریب آ کر دیکھا، تو بڑے خوبصورت جنگل نظر آئے۔ کہیں کہیں اُوپر سے آبادیوں کے ڈبّے نظر آئے۔ اور اُن میں چھوٹے

Scanned by CamScanner

چھوٹے مکوڑوں کی طرح چلتے ہُوئے انسان! پر بستیوں کے ڈبّے بڑی دُور دُور رکھے ہُوئے تھے۔''

امجد نے اُس روز، اپنے حصّے کی نارنگی اُٹھا کر گُلدان کے پیچھے چھپا کے رکھ دی۔
جب تک نئی تازہ نہیں ملے گی، وہ اُسے پھینکنے بھی نہیں دے گا۔
امجد کا بُخار بھی، ماموں کی کہانی کی طرح چلتا ہی جا رہا تھا۔

ماموں کی کہانی کا اگلا حصّہ بھی، اگلے روز ہی شُروع ہُوا۔
''ہاں تو پھر کُچھ سو سال کے بعد، ایک بار پھر کُچھ سپیس کرافٹ اِس زمین کی طرف آئے۔ اِس بار نیلی نارنگی ڈھونڈتے تھوڑا وقت لگا اُنہیں۔ ماحول میں غُبار پہلے سے زیادہ تھا۔ Ozon کی ایک ہلکی سی تہہ بادل کی طرح بہنے لگی تھی۔ اور نیچے، اندر آ کر دیکھا کہ مکوڑوں کے گھومنے پھرنے سے باقاعدہ لکیریں بن گئی تھیں اس پلینیٹ پر۔ وہ لکیریں ایک بستی سے دُوسری بستی میں جا کر گُم ہو جاتی تھیں۔ اُن لکیروں پر انسان کے چلنے کی رفتار بھی پہلے سے تیز نظر آتی تھی۔ لگتا تھا ایک مکوڑہ دُوسرے مکوڑے کو اُٹھا کر بھاگے چلا جا رہا ہے۔ انسان نے شاید جانوروں پر سواری کرنا شروع کر دی تھی۔ بستیاں بھی پہلے سے بڑی ہو گئی تھیں اور زیادہ ہو گئی تھیں۔ کئی جگہ تو بڑے خوبصورت سُنہری رنگ کے تھے تھے سورج جلتے دِکھائی دیتے تھے۔ انسان آگ دریافت کر چُکا تھا۔ لیکن جہاں سبز جنگل دِکھائی دیتے تھے، وہاں سیاہ رنگ کا دُھواں بھی نظر آیا تھا۔ شاید جنگل جلا کر بستیوں کے لیے جگہیں صاف کی جا رہی تھی۔ زمین کی نارنگی اب اُتنی تازہ اور شگفتہ نہیں لگتی تھی، جتنی اُن سے پہلے آنے والوں نے بیان کی تھی۔''

Scanned by CamScanner

امجد اس کا راز جانتا تھا۔ اُس نے دیکھا تھا اُس کی نارنگی میں سوراخ ہو چکے تھے۔ اُس نے سوراخ کے آس پاس کچھ چیونٹیوں کو ٹہلتے بھی دیکھا تھا۔ اور جہاں پھیکے داغ دِکھائی دیتے تھے، وہاں اب کالے اور سفید پھپھوندی والے دھبے پڑ گئے تھے۔

ماموں ایک بار پھر اپنا سپیس کرافٹ لے کر لوٹ گئے۔ پھر کچھ دن بعد جب اپنی کہانی پر لوٹے تو کچھ صدیاں اور بیت چکی تھیں۔

''سپیس کرافٹ کے لوگوں نے آ کر دیکھا، وہ جس زمین کو بہت صدیوں پہلے ایک تازہ شگفتہ پلینیٹ دیکھ چکے تھے۔ اب اُس کے اُوپر کا Ozon ایک زہریلی پتلی پھپھوندی کی طرح زمین کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ میلے کچلے پھٹے پُرانے چیتھڑے کی طرح۔ زمین کے ماحول میں دُھواں ہی دُھواں تھا۔ ریڈیو ایکٹو نوئیس پولیوشن (Radio active Noise Pollution) سے بھرا ہُوا۔ سبز جنگل بہت کم رہ گئے تھے۔ انسانوں کی بستیوں نے تقریباً ساری زمین گھیر لی تھی۔ ساری زمین مکوڑوں سے بھر گئی تھی۔''

امجد کی نارنگی بالکل سڑ چکی تھی۔ اور کیڑے مکوڑے اُسے نوچ نوچ کر کھائے جا رہے تھے۔

Scanned by CamScanner

دوڑ دوڑ کے قدم ملاتا نہوں
زندگی یہ کتنی تیز چلتی ہے!

Scanned by CamScanner

مٹی تلے

پتہ نہیں وہ کب سے اُس اندھیرے میں پڑا تھا۔

لیکن بہت دھیرے دھیرے جب اُسے ہوش آیا تو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بہت دیر تک کانپنے کے بعد جب زمین ٹھہری تب پہلی بار اُس نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ زمین ابھی تک ہل رہی تھی۔ اُس نے زور لگا کے زمین کو روکا اور دُوبارا آنکھیں کھولیں۔ اُٹھنے کی کوشش کی تو پیٹھ پر پڑی سیمنٹ کی سِل نے پھر دبا دیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دِیا۔ ایک بار پھر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ دونوں ہاتھ مٹی میں دھنسے ہوئے تھے۔ اُس نے سر وہیں زمین پر ٹِکا رہنے دِیا۔ تب دھیرے سے ذہن نے کروٹ لی اور یاد آیا کہ زلزلہ آیا تھا..... زمین پھر سے جھولتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ سو رہا تھا جب اُس کا بستر ڈولنے لگا۔ اُس کے کانوں میں کھٹ کھٹ کی ایک مسلسل آواز آ رہی تھی۔ کمرے کے کونے میں کھڑی سٹیل کی الماری کانپ رہی تھی، جیسے ملیریا میں بخار آنے سے پہلے بدن کانپتا ہے۔ باہر کچن تھا۔ کوئی چمچ تھالی بجا رہا تھا۔ برتن بج

Scanned by CamScanner

رہے تھے۔ ہلکے ہلکے، ڈرے ڈرے سے۔ اچانک وہ پُوری طرح بیدار ہوگیا۔ وہ زلزلہ تھا۔ وہ کُود کے بستر سے اُٹھا۔ بتی آن کی تو بلب مدھم ہی سا جل کے بجھ گیا۔ اُسی وقت سوسائٹی کے لوگوں کا شور کان میں پڑا۔ وہ دروازہ دھکیل کر، سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ لفٹ بند تھی۔ مین سُوئچ کسی نے آف کر دیا تھا۔ عورتوں کی چیخ پُکار سُنائی دی۔ سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کے نیچے بھاگ رہے تھے۔ دو منزلیں وہ کیسے پھلانگ گیا اُسے پتہ نہیں، جب اُوپر سے مٹی گرنے کا احساس ہوا۔ سیڑھیاں ہلیں۔ زلزلہ شاید گُڑگُڑاتا ہوا گذر رہا تھا، یا گذر گیا تھا۔ یا اُس کے گلے میں ابھی تک گُڑگُڑا رہا تھا۔ اُس کے گھٹنے کانپنے لگے۔ وہ گر گیا۔ کچھ لوگ اُس کے اُوپر سے لڑھک گئے اور پھر ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ اُس کے نیچے کی سیڑھیاں ڈوبتی ہوئی پاتال میں اُتر گئیں اور اندھیرا ہوگیا۔

وہ ابھی تک پاتال میں تھا.....

بُخاری کو یاد نہیں وہ کب سے اُس اندھیرے میں پڑا تھا۔ شاید کئی دن سے۔ کہیں کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں.... ہلانے کی کوشش کی تو لگا جم گئے ہیں۔ یا بندھے ہوئے ہیں۔ تیزی سے ایک خیال ذہن سے گذرا میں قبر میں ہوں۔ مٹی، پتھر، اندھیرا..... کیا غلطی سے دفنا دیا لوگوں نے یا... مَر چُکا ہوں... کوشش کی تو سَر بھی نہیں ہلا۔ لگا شاید مَر چُکا ہے وہ۔ تھوڑی دیر میں منکر اور نکیر آئیں گے۔ اُسے کلمہ پڑھنے کے لئے کہیں گے۔ مَر جائیں تو تیسرے روز آتے ہیں یہ فرشتے!.... یعنی تین روز ہوگئے اُسے دفن ہُوئے۔ اگر زندہ ہوتا تو تین دن میں اُسے بھُوک بھی لگتی۔ ایک عجیب سی تسکین ہوئی اُسے کہ وہ مَر گیا ہے۔ اُسے بھُوک بھی نہیں لگی اور اُس کی یادداشت بھی قائم ہے۔ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ سیدھا پڑا ہے یا اوندھا پڑا ہوا ہے۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ جب قبر میں

Scanned by CamScanner

اُتارتے ہیں تو چہرہ کس طرف ہوتا ہے؟ اُسے پھر سے نیند آنے لگی۔ موت میں کتنا سکون ہے۔ نشہ ہے۔ زمین پھر سے ہل رہی تھی۔ جھول رہی تھی۔ وہ سونے جا رہا تھا۔ پالنے میں۔ قبر پالنے کی طرح جھول رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں فرشتے آئیں گے۔ اُسے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اور وہ پھر سو گیا۔

بدن ہلکا لگ رہا تھا۔ جسم کا احساس ختم ہو رہا تھا۔ ہاتھ، پاؤں، کوئی جوڑ بدن کا، کچھ بھی نہیں ہل رہا تھا۔ اور اُسی طرح دماغ بھی بڑا مدھم مدھم جلتا تھا اور بُجھ جاتا تھا.... اُسے واقعی یقین ہونے لگا کہ وہ قبر میں ہے اور مَر چُکا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہوگا مَرنے کے بعد لیکن فرشتے کب آئیں گے۔ لب ہلائے بغیر اُس نے اپنے ہونٹوں پہ مُسکراہٹ محسوس کی۔ ایک روشن آیت رینگتی ہوئی پیشانی کے اُوپر سے گذر گئی ______ لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ ھُو محمد الرسُول اللہ ھُو! آنکھیں بند ہی تھیں، مگر اُس نے پھر سے بند کرلیں۔ پھر سے نیند میں ڈوب گیا۔ اور پھر کئی دن تک نہیں جاگا۔ خود اُسی کے دماغ نے پھُسپھُسایا: 'اب تو قیامت کے روز ہی اُٹھوں گا۔

ایک جھٹکے سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ دماغ جاگ گیا۔ کوئی اُس کی پلکیں اُٹھا کے دیکھ رہا تھا۔ کچھ رینگ رہا تھا اُس کی پلکوں پر۔ شاید........ پہلی بار اُس نے اپنے سینے میں سانس بھرتی ہوئی محسوس کی۔ شاید اُسے جگایا جا رہا ہے۔ قیامت کا دن آ گیا۔ پلکوں سے رینگتی ہوئی کچھ پتلی پتلی سی لکیریں، یا اُنگلیاں، یا ناخن، یا....... ماں کے گیلے بال.....یا کوئی پتلی قلم سے ماتھے پر کچھ لکھ رہا تھا۔

''آیتیں........!''

کوئی ایک پیر کے نیچے' تلوے پر بھی لکھ رہا تھا۔ دایاں بایاں وہ شناخت بھول

Scanned by CamScanner

گیا۔شاید فرشتے اُس کے اعمال اُس کے جسم پر درج کر رہے تھے۔

پُر لب بلائے وہ مُسکرا رہا تھا۔ قیامت کا شور قریب آ رہا تھا۔ اُسے آوازیں سُنائی دینے لگیں۔اب اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو رہی تھیں۔ بلب بُجھ گیا۔ وہ سو گیا۔ قبر پھر جھولنے لگی۔ فرشتے اُسے اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ نیچے اور نیچے۔ وہ پاتال میں ڈُوبتا جا رہا تھا۔

بلڈنگوں کا ملبہ صاف ہو رہا تھا۔ زلزلہ کئی جگہ سے زمین اُدھیڑتا ہوا گذر گیا تھا۔ بلڈنگوں کے نیچے سے کئی کئی دن تک لوگ برامد ہوتے رہے۔ کچھ اَدھ مرے، کچھ زخمی، کچھ مُردہ۔ مُردوں کو دفن کر دیا گیا تھا یا جلا دیا گیا۔ جن کی فوراً پہچان نہیں ہو پائی، کچھ روز بعد اُن کی آخری رسومات بھی پُوری کر دی گئیں۔ ہسپتال بھر چکے تھے۔ بہت جگہوں پر زلزلے سے مُتاثر لوگوں کے کیمپ کھُل گئے تھے، سرکار کے علاوہ عوام بھی ہر طرح کی مدد کر رہے تھے۔ اخباریں اُن لوگوں کی مدد کے لئے چندہ جمع کر رہی تھیں۔ اُسی میں ایک روز اخبار کے ایک صفحے پر بُخاری کی تصویر چھپی۔

اٹھارہ روز کے بعد بخاری کو عباسی بلڈنگ کے تہ خانے سے نکالا گیا جہاں اُس کا جسم کاکروچوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ زندہ تھا، اور بے ہوش تھا۔ نبض بہت مدّھم تھی، مگر چل رہی تھی۔ اُسے فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

کئی روز کے بعد جب بخاری پُوری طرح ہوش میں آئے تو، دَردوں سے کراہ رہے تھے، اور ڈاکٹروں سے کہہ رہے تھے!

''یہ کیا قیامت ہے۔ کس دوزخ میں اُٹھا لائے مجھے!''

Scanned by CamScanner

شورٹ کٹ

سیدھا راستہ بہت لمبا تھا۔ پہاڑوں کے گرد گھومتا، گرتا، ہمکتا ہوا بان پور پہنچتا تھا۔ وہاں سے سیدھا آنند پریاگ! پکی سڑک تھی پھر بھی کہیں کہیں اُدھڑے کھدڑے حصے آجاتے تھے۔ لیکن پہاڑی راستے تو اب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بارشوں میں اُدھڑ جاتے ہیں اور سوکھے میں بنتے رہتے ہیں۔

ہم ایک ڈھابے پر رُکے تھے، جو ڈھابا بھی نہیں بس ڈبہ ہی سمجھو۔ ہم تین تھے۔ بھوشن، ترن تارن اور میں۔ رُکے تھے چائے پینے۔ پھر مرتبان میں پڑی رسک نکال لی۔ پھر اُبلے ہوئے انڈے دیکھے تو جی چاہا، کاٹ کے نمک کالی مرچ ڈال کے، دو ایک نگل جائیں۔ چھو کے دیکھا تو ٹھنڈے پڑے تھے۔ دُکاندار سے کہہ دیا ایک درجن اُبال دے۔ گاڑی میں رکھ لیتے ہیں۔ راستہ لمبا ہے، برانڈی کے گھونٹ نگلنے میں مدد کریں گے۔ ٹھنڈ بہت تھی، اس لئے برانڈی کی بوتل ساتھ رکھی وِی تھی۔ بیچ بیچ میں سانس گلے میں جم جاتی تو پگھلانے کے لئے، بوتل کا ڈھکن بھرتے اور اندر لڑھکا لیتے۔ کچھ دیر کے لئے نالی صاف

Scanned by CamScanner

ہو جاتی۔

انڈے اُبلواتے، چبینا پھانکتے، چائے پر چائے بنواتے، ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا اُس ڈبّے جیسے ڈھابے پر۔ دو ٹرک والے اور بھی آ کر رُک گئے۔ جب اتنی دیر ہو گئی تو لگا بان پُور پہنچتے تو رات ہو جائے گی اور راستہ اگر ایسا ہی ہُوا تو شاید بہت رات ہو جائے۔ ہمارے ڈرائیور کو خیال آیا، دس بیس یا پچیس تیس کلومیٹر آگے ایک 'شورٹ کٹ' راستہ نکلتا ہے بان پُور کے لئے۔ راستہ بہت اچھا تو نہیں، لیکن 'دھینو' اور بامنی گاؤں سے گذرتا ہُوا، 'الک گنگا' کے ساتھ ساتھ ہی چڑھتا اُترتا بان پُور جا نکلتا ہے۔ ساتھ ہی یہ رائے بھی دے دی کہ جان جوکھم میں ڈالنے کی جلدی بھی کیا ہے؟

''جوکھم جھیلنے کو تو جندگی پڑی ہے سر جی!''

راستہ بھی دوڑتے کُتّے کی طرح زبان نکالے رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب چوڑا ہو جاتا ہے، کب پتلا! کچے راستے جھیلنا پھر بھی آسان ہے۔ پکّے راستوں پر تو جان نکلی رہتی ہے۔ ہر ایک دھچکے پر یہی لگتا تھا اب گئے کہ اب گئے۔ ہر موڑ پر اُوپر سے پہاڑ گرتا نظر آتا ہے! ڈرائیور مسلسل بولے جا رہا تھا۔

''اُوپر سے آئے تو یہاں کے لوگ کہتے ہیں۔ پہاڑ آتا ہے!''

''اور نیچے جاتے کو؟ جب لینڈ سلائیڈ ہو جائے؟''

''نیچے والے بولے گا جی، پہاڑ آیا۔''

''یا ہم کہہ دیں گے کہ، ہم آئے۔''

''ہمیں تو بولنے کی پھُرست ہی کہاں ملنی ہے باؤ جی؟'' وہ سیٹ پر اُچھل اُچھل کے ہنستا تھا۔

Scanned by CamScanner

پہاڑی راستوں کا اپنا ہی رومانس ہے۔ہم دُھوپ میں چل رہے ہیں۔ کہ سامنے کہرہ پردہ کھینچ کے کھڑا ہوگیا۔ ''ٹھہرو!''

پُوچھا ''کیا پیچھے کوئی نہار رہا ہے؟''

ہم کھڑے رہے۔ کُچھ دیر بعد دھیرے سے کہرہ ہٹ گیا۔ سامنے نہائی دھوئی ست رنگی قوس کھڑی تھی۔

پہاڑوں پہ راستے بار بار مٹھے تیز ہوتے رہتے ہیں اس لئے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہُوئے لوگ بھی بار بار ملتے بچھڑتے رہتے ہیں۔'دیو پریاگ' پر ایک گاڑی بڑی تیزی سے نکلی تھی ہمارے پاس سے، ہارن دیتی ہوئی۔ چھوٹی سی ''ہیرلڈ''۔ ہمارے جیپ ویگن والے ڈرائیور نے پنجابی میں مذاق کیا___

''لے بھئی، صابن دانی کو بھی پَر لگ گئے۔'' اور خود ہی سیٹ پر اُچھل اُچھل کر ہنسنے لگا۔

سُنا تھا کہ دیو پریاگ، جہاں گنگا اور الک گنگا آ کر ملتی ہیں، وہاں ایک ڈیم بنے گا اور دیو پریاگ پانی میں ڈوب جائے گا۔ خواہش ہُوئی کہ چل کر دیکھ آئیں۔ ترن تارن بولے!

''تو پھر اُوپر 'رُودر پریاگ' تک چلتے ہیں۔''

اور بھُوشن نے رائے دی۔

''اور اُوپر آنند پریاگ چلو تو وہاں سے 'درونا گری' ہوتے ہُوئے نینی تال نکل جائیں سیدھے۔''

جوشی مٹھ اور بدری ناتھ ہم ایک بار پہلے جا چکے تھے۔ بھُوشن اور میں!

اِس بار ہم نے گاڑی تو دِلّی سے ہی لی تھی، لیکن ہری دوار پہنچتے پہنچتے گاڑی کُچھ

Scanned by CamScanner

تکلیف دینے لگی۔

گاڑیوں کا علاج بسوں کے اڈے پر ہوتا تھا۔ وہاں گئے تو رشی کیش کے نوجوان مہنت اشوک پروہت مل گئے ____ اپنی گاڑی میں کسی کو چھوڑنے آئے تھے۔ بولے:

''سامان ڈرائیور لے آئے گا۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ چلو۔''

ہری دوار سے رشی کیش تک ہم تینوں اشوک مہنت جی کی گاڑی میں آئے۔ ہری دوار میں ڈرائیور نے کہا تھا کہ: ''گھنٹے بھر کا کام ہے گاڑی میں، یہیں کرالیں تو اچھا ہے ورنہ وہاں پہنچنے تک....''

اشوک بات کاٹ کر بولے تھے۔

''ہاں کرالو۔ آرام سے کرالو۔ اور رشی کیش پہنچ کر سیدھے ہمارے آشرم میں آجاؤ۔ صاحب لوگ وہیں ملیں گے۔''

راستوں کے جو کھم مہنت جی خوب جانتے تھے۔ پہاڑوں کے ایک ایک موڑ سے واقف تھے۔ گاڑی کو ہری دوار سے آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ رات وہیں ٹھہرنا پڑا۔ صبح نکلتے پھر دیر ہوگئی۔ صبح کی ہوا سونگھ کر ہی مہنت جی نے کہہ دیا۔ ''لگتا ہے کل رات جوشی مٹھ میں بھاری برف پڑی ہے۔'' دستانے، موزے، مفلر کس کے پھر نکل پڑے۔

اب آشرم سے چلے ہمیں چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ہم ڈھابے سے نکلے ہی تھے کہ وہی ہیرلڈ ایک بار پھر ہمارے بغل سے کٹی کاٹ کے نکل گئی۔ ڈرائیور نے کہا۔

''جی یہ آپ کا صابن دانی والا بڑی جلدی میں ہے۔ باز ہی نہیں آتا!''

''وہ ہے کون؟ گاڑی تو اِدھر ہی کی لگتی ہے۔''

''ہے تو اِدھر ہی کا جی! اب کیا کہیں۔ لگائی تو پُرانی اچھی لگے' پر گاڑی پُرانی

Scanned by CamScanner

ہو جائے تو بدل لینا چاہیئے۔ یہ تو دونوں ہی کو چپک کے بیٹھا ہے۔''

اس بار تو گڈھا بھی نہیں تھا، پھر بھی وہ سیٹ پر اُچھل اُچھل کے ہنسا۔

''کسی دن راستے میں بیٹھ گئی تو مائیکے والے ہی لے کر جائیں گے۔''

ڈرائیوروں کی زبان الگ ہی ہوتی ہے۔ وہ ٹرک والا ہو یا ٹیکسی والا۔ ساری امیجری گاڑی سے جُڑی ہوتی ہے۔ بڑا عشق کرتے ہیں اپنی گاڑی سے۔ اکثر تو نام بھی نمبروں میں بدل دیتے ہیں۔ ڈھابوں پہ کئی بار سُنا ہے۔

''اوئے چونتی چھتی (36 - 34) اِدھر ہی آجا۔ گھُٹ مار لے۔ کُکڑ بھنوایا ہے۔''

پہاڑوں پر چڑھتے ہُوئے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ دُنیاداری نیچے چھوڑ آئے۔ دونوں طرف اُونچے اُونچے دراز قد کے پیڑ بڑے بے نیاز لگتے ہیں۔ آسمان کے حقدار نظر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے جنگل میں ٹہل جاؤ، تو وہاں خاموشی بھی صُوفیوں کی طرح گھُومتی نظر آتی ہے۔ خود ہی کُچھ کہتی ہے، خود ہی سُنتی ہے۔

سُورج دھیرے دھیرے پہاڑی کے پیچھے جا رہا تھا۔ آسمان سُرمے لگی آنکھ کی طرح پہاڑوں کے بیچ بیچ سے جھانک لیتا تھا۔ کُچھ دیر بعد ہی، وہ راستہ دِکھائی دیا جو بان پُور کے لئے شورٹ کٹ تھا۔ بائیں طرف مُڑ گیا تھا۔ دُور وہی ہیرلڈ جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ہم نے ڈرائیور کو روکا۔

''ویر سنگھ، اِسی راستے سے نکل چلتے ہیں۔ اگر اُس کی پُرانی ہیرلڈ جا سکتی ہے تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ اپنی تو جیپ ہے۔''

Scanned by CamScanner

ڈرائیور نے گاڑی روکی، کچھ سوچ کر، ریورس میں لی اور کہا!

''اُس کی پُرانی جوڑو ہے سر جی، اور کوئی پیسنجر بھی نہیں ہے۔ اپنی تو.... راستے نے ایک دھچکہ دیا تو.....'' چُپ ہوگیا۔

پھر کہا۔ ''نیچے تکیے رکھ لو۔ نئیں تو.....'' اور ہنس دیا۔

کیا خوب زندگی ہے پہاڑوں کی۔ پہاڑی راستوں کی۔ آسمان کہیں انگلی پکڑ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کہیں باپ کی طرح اُچھال کے کندھے پر لے لیتا ہے۔ پھر اُتار دیتا ہے۔ لڑکھڑاتے ڈگمگاتے آپ چلتے رہیئے۔ وہ دُور سے دیکھتا رہتا ہے۔ چلتے چلتے آپ کسی ندی، کسی دریا کی انگلی پکڑ لیتے ہیں اور دریا کب ہاتھ چھوڑ دیتا ہے، پتہ بھی نہیں چلتا۔ اچانک سڑک کنارے کوئی چھوٹا سا چھینکتا ہُوا جھرنا نظر آجاتا ہے۔ جی چاہتا ہے اُتر کے پاؤں دھولیں۔ لیکن ایسی ٹھنڈ میں گاڑی کے ٹائیر دھو کے ہی تسلی ہو جاتی ہے۔ پانی دیکھ کے ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے۔ برانڈی کا ایک اور ڈھکن، بقول منٹو کے 'انقلاب' کہتا ہُوا گلے سے اُتر جاتا ہے۔

اچانک ڈرائیور نے گاڑی روکی اور اُتر گیا۔ ہماری نگاہوں نے اُس کا تعاقب کیا۔ ایک بڑا سا بولڈر، ایک پتیہ اور ایکسل راستے میں پڑا ہُوا تھا۔ ویر سنگھ جھانک کر نیچے وادی میں دیکھ رہا تھا۔ جب کافی دیر تک وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تو ہم ایک ایک کر کے گاڑی سے اُترے۔ کیچڑ مٹی سے پائینچے اُوپر اُٹھائے، اُس کے قریب پہنچے۔ نیچے، بہت نیچے کھائی میں ہیرلڈ کا راوندھی پچکی پڑی دِکھی اور دُور پڑی ڈرائیور کی بے حس باڈی نظر آرہی تھی۔ ویر سنگھ نیچے اُترنے کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ بھوشن نے خوف سے بھری آواز میں پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''کوئی چانس ہے؟ ___ بچ گیا ہو؟''

''ناں جی!... کمبخت وہاں بھی شورٹ کٹ مار گیا۔''

ویر سنگھ کی آواز رُندھی ہُوئی تھی۔

Scanned by CamScanner

گرہ کٹ

ہسپتال کے لئے بھاگ رہا تھا وہ۔ خبر آئی تھی، ذکیہ کی کوکھ کا پانی بہہ گیا ہے۔ وہ کسی وقت بھی بچے کو جنم دے سکتی ہے۔ جس پڑوسن کے ساتھ گئی تھی، اُسی نے آ کر خبر دی۔

''ڈاکٹروں نے پہلے تو آٹھ دن بعد کی تاریخ دی تھی___ لیکن بڑے میاں نے ...'' دانت کاٹ کے، کان پکڑ کے اُس نے اپنی ہی گدی پر دھپ جمائی۔ لاڈ اور اشتیاق میں وہ اکثر خُدا کو، بڑے میاں کہہ جاتا تھا۔ ایسی جلدی میں کُرتا پہنا کہ بغل کے نیچے سے، کھچ کر تھوڑا سا اور پھٹ گیا۔ ذکیہ پہلے ہی مسخری کیا کرتی تھی۔

''یہ سُوراخ کیا ہوا آنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اُتار دو میں سی دیتی ہوں۔''

لیکن ایک بار پہننے کے بعد، وہ ہمیشہ آلس کر جاتا ہے___

''اوئے کوئی نہیں۔ بغلیں دبا کے رکھوں گا۔'' پھر کہتا: ''چھوٹا 'ننھا' کوئی

آجائے تو نیا سلوالوں گا۔ گود میں جو اُٹھانا ہوگا اُسے۔''

وہ ہنس دیتی ___ ''لے! کوئی کل پرسوں تھوڑے ہی ہو جانے والا ہے۔ ابھی تو چھ مہینے پڑے ہیں۔ تیسرا ہی لگا ہے ___!''

''چوتھا ہُوا نہ بھئی۔ اور کیوں آگے کر رہی ہے؟''

بڑی منتیں مانگ مانگ کے اُس کی بیوی کی گود بھری تھی۔ شادی کے چار سال ہونے کو آ رہے تھے۔ اور اب دن دن کر کے ہفتے گنتا تھا۔ اور ہفتہ ہفتہ کر کے مہینے!

سیڑھیاں لڑھک کے نیچے اُترا، اور خیال آیا کہ بٹوا تو اُوپر ہی رہ گیا۔ پھر لپک کے اُوپر چڑھا۔ سانس پھول گئی۔ پھر تالا کھولا اور اندر گیا۔ بٹوہ وہیں رکھا تھا جہاں کُرتا بدلا تھا۔ بڑی خفت ہوتی ڈاکٹروں کے سامنے، اگر کہتا جلدی میں گھر بھول آیا۔ لیکن ڈاکٹر چوپڑہ دلدار آدمی ہیں وہ سمجھ جاتے۔ شروع سے وہی دیکھتے آ رہے ہیں، ذکیہ کی زچگی کو۔'' لیکن تاریخ تو ابھی آٹھ دن آگے کی بتائی تھی۔ یہ جلدی کس نے کری۔ ذکیہ نے؟ یا... اُوپر والے نے!'' اِس بار سوچ کے خود سے بولا۔ بٹوہ جیب میں ڈالا اور لوٹ لیا۔ اب کے سیڑھیاں قدم قدم اُتر کے گیا۔ لیکن نیچے پہنچ کے خیال آیا۔ تالا تو لگایا ہی نہیں۔ خود ہی سے کہا: ''کوئی نہیں۔ گھر بڑے میاں دیکھ لیں گے۔'' پھر دانت کاٹا، گدی پہ چپت جمائی۔

''گھر وہی دیکھے گا۔ ہسپتال پہنچتے دیر ہوگئی تو؟'' پتلی گلی ریوڑی بازار کی۔ باہر آتے آتے گڑ کی خوشبو سے ہی گلا تر ہو گیا۔ کندھے چھیلتا، مین روڈ پر آیا تو لگا آٹو دیکھنے۔ کئی آس پاس سے بل کھا کے گزر گئے، کوئی خالی نہیں تھا۔ سُلطان بے چین ہونے لگا۔

''دن رات تو سالے کوکروچوں کی طرح گھومتے ہیں ٹریفک میں! اب جب

Scanned by CamScanner

ضرورت ہے تو ایک بھی نظر نہیں آتا ___ ''

تیز تیز قدم اُٹھاتا چل دیا ہسپتال کی طرف۔ لیکن گردن گھما گھما کے دیکھتا گیا کوئی رکشہ مل جائے ___ دسیوں لوگوں سے ٹکرایا۔

''سامنے دیکھ کر چل بھائی۔''

''پیر اُلٹے لگے ہیں کیا؟'' سُلطان کو اس جملے پر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ یہ محاورہ تو پہلے نہیں سُنا تھا۔ اُلٹی سیدھی تک بندی کا شوق اُسے بھی تھا۔ مُسکرا دیا۔

اچانک سامنے سے آتا ایک رکشہ نظر آ گیا۔ ہاتھ جھلایا تو ایسے جھوم کے ساتھ آ لگا جیسے پالتو ہو ___

''سرکاری ہسپتال''، کہہ کے بیٹھ گیا ___ حالانکہ دوڑ لیتا تو یہ آٹھ روپے بھی بچ جاتے۔ آدھا راستہ تو آ ہی گیا تھا۔ اچانک جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوہ ندارد! جیب کی دُوسری طرف سے ہاتھ باہر آ گیا ___ جانے کب کٹ گئی۔

اُس نے رکشہ والے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''اے بھائی ___'' اور کٹی ہوئی جیب دِکھائی۔

''معاف کرنا بھائی... راستے میں...'' اُس کی آواز بھیگ گئی۔ رکشے والا ایک پل رُک کر آگے چل دیا۔

''کوئی بات نہیں ___ کبھی ہو جاتا ہے۔'' پتہ نہیں اُسے کیوں یقین آ گیا۔

سُلطان یاد کرنے لگا۔ کب ہُوا؟ ___ کس جگہ؟ ___'' وہی بات رکشے والے نے پُوچھ لی۔

Scanned by CamScanner

''کب ہُوا؟___ کس جگہ؟''

''ابھی ابھی۔ بازار میں۔ ریوڑی بازار میں رہتا ہوں۔ وہیں سے آرہا ہوں___ پتہ نہیں کب ہاتھ دِکھا گیا___؟ دِکھایا بھی کہاں یار۔ بڑے میاں کی طرح، اِن کی بھی کوئی صُورت نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کب کرتب دِکھا جاتے ہیں!''

ہسپتال آ گیا تھا۔ وہ اُترا اور کچھ کہنا چاہا رکشے والے کو۔ لیکن اُس نے مُسکرا کے ہاتھ دِکھایا اور سامنے ہی دُوسری سواری مل گئی۔

سُلطان کا مُنہ اُتر گیا۔ بھاری قدموں سے ہسپتال میں داخل ہوا۔ اور دُوسری منزل پر چوپڑہ صاحب کے کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا___ لفٹ بھی نہیں لی۔ بہت لمبی لائن تھی وہاں___ چپراسی نے بتایا، ذکیہ کو اچانک درد اُٹھنے لگے تھے۔ اُسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں۔ ڈاکٹر چوپڑہ وہیں پر ہیں۔

سامنے کی لوبی میں ایک خالی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بار بار خالی جیب میں چلا جاتا تھا۔ بار بار رکشہ والے کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ اب ڈاکٹر چوپڑہ سے بھی کہنا ہوگا۔

بیٹھے بیٹھے اُونگھ آ گئی۔ اس لئے پتہ نہیں چلا کتنا وقت گیا جب ڈاکٹر صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنے کمرے میں لے گئے۔

''ذکیہ کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''ٹھیک ہے۔''

''اور بچّہ؟___'' چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھ میں سوال تھا۔ ''لڑکا یا لڑکی؟''

ڈاکٹر صاحب نے سر جھکایا تو دونوں بُجھ گئے!

Scanned by CamScanner

''سُلطان بچہ مُردہ پیدا ہوا ہے!''

ایک سناٹا سر سے پاؤں تک دوڑ گیا۔ وہ سُن ہو گیا۔ دیکھتا رہ گیا ڈاکٹر صاحب کو۔

''ذکیہ ٹھیک ہے ___! بے ہوش کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جائے گی۔''

سُلطان کی آنکھیں اچانک خشک ہو گئیں۔ ہاتھ کٹی ہوئی جیب میں چلا گیا۔ پتہ نہیں کیوں۔ مُسکرایا وہ۔ ہلکا سا!

''کیا یار! تُو تو اُس سے بھی بڑا گرہ کٹ نکلا ___! آپے گود بھری تھی اُس کی۔ اور آپے ہی... جیب کاٹ لی! گرہ کٹ!!''

Scanned by CamScanner

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرا
آری سے کٹتے نہیں نابھی کے رشتے ___!

Scanned by CamScanner

سانجھ

لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بُوڑھیا (لالائن) نے بال کٹوا دیئے اور اُن سے پوچھا بھی نہیں۔

پچھلے مہینے اُن کی بہُو مائکے گئی تھی تو اپنی ساس کو ساتھ لے گئی تھی دِلّی، کہ ٹرین میں گود کے بچّے کو سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔ لالہ جی سے خُود مایا دیوی نے پوچھا تھا ..... ''بہُو کہہ رہی ہے دِلّی چلنے کے لئے۔ جاؤں؟''

''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ ٹرین کے دھکّے میں بیچاری بہُو کیسے سنبھالے گی بچّے کو؟''

اُن کی بہُو، منی کے پِتا ریٹائیر کرنل ہیں۔ منی کے دو بھائی بھی ملٹری میں بڑے عہدوں پر ہیں۔ کرنل صاحب کا پارٹی میں آنا جانا آج بھی اُسی طرح جاری ہے۔ ظاہر ہے اُن کی پتنی اُنہیں کے اِسٹائیل میں رہتی ہیں۔ موڈرن ہیں۔ اِسٹائیلسٹ ہیں۔ اُنھوں نے بال کٹوا رکھے ہیں، اِس بار مایا دیوی کے بھی کٹوا دیئے۔

Scanned by CamScanner

دو ہفتے بعد بمبئی واپس لوٹیں تو لالہ جی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ''یہ بال کا کیا کیا تُم نے؟''

''سمدھن نے کٹوا دیئے۔ اپنی طرح کے بنوا دیئے۔'' یہ کہہ کر مایا ہنسی ضرور لیکن ایک سایہ جو گذرا، اُن کے پتی کی آنکھ سے، وہ ڈر گئیں۔ اپنے شوہر کی نظر وہ پہچانتی تھیں۔ اڑتالیس برس کا ریاض تھا۔ کھسیانی سی بولی۔ ''پھر رکھ لُوں گی، بڑھ جائیں گے۔''

لالہ جی چُپ چاپ اندر چلے گئے اور بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔ رات کھانے کی میز پر بھی اُن کا موڈ بُجھا بُجھا ہی رہا۔ منوج نے پوچھا۔ منی نے بس سر ہلا دیا۔ ''کُچھ نہیں۔''

مایا دیوی نے جب پوچھا.... ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' تو جواب کُچھ اور ہی دیا.... ''تُمہارے بال تو بہت اچھے تھے، خُوبصورت تھے کٹوا کیوں دیئے؟'' کوئی جواب نہ مِلا تو بولے.... ''اور تُم نے... مُجھ سے پوچھا بھی نہیں۔''

منوج ہنستا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا.... ''بابُو جی کو ابھی تک ماں کے بالوں کی فِکر لگی ہے۔ ستر باہتر کے ہو گئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی!'' منی نے جو بڑی کی کنگھی کر رہی تھی ہنس کر پوچھا.... ''بابُو جی کی کیا لَو میرج تھی؟''

''نہیں ماں کی شادی تو میرے سامنے ہوئی۔ اُن کے ماں باپ نے کروائی تھی۔''

''مطلب....؟''

''دونوں نے گھر سے بھاگ کے کورٹ میرج کر لی تھی۔ چار پانچ سال کے بعد

Scanned by CamScanner

میں پیدا ہُوا۔ میری پیدائش کے بعد دونوں کے ماں باپ نے معاف کر دیا اور صُلح ہو گئی .....ماں مُجھے لے کر پیرنٹس (والدین) کو ملنے گئی تو اُنھوں نے بابُو جی کو گھر سے نِکال دیا۔ یہ کہہ کر کہ بجُّو جاؤ اب بارات لے کر آؤ تب لڑکی دیں گے۔ تب دوبارہ شادی ہوئی اُن کی۔ مُجھے یاد تو نہیں لیکن .....پتا ہے۔ تصویر بھی ہے۔"

لالہ ہیمراج کو کھانے کے بعد سیر کی پُرانی عادت تھی۔ کُچھ دیر ٹہلنے کے لئے باہر چلے جاتے تھے۔ نُکڑ سے ایک پان بنواتے اپنی پسند کا۔ عُمر کے ساتھ سُپاری ضرور کم ہو گئی تھی۔ لیکن ایک روز پنواڑی کی دُکان سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ اِتنی سی بات پتا نہیں کیوں بھنور کی طرح اُن کی سوچ میں اَٹک گئی تھی...... سانجھ ہی تو ہے۔ اُسے حق کہہ لو، ادھیکار کہہ لو یا..... کوئی مُناسب لفظ ملا نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا اُن کی بڑی قیمتی چیز چوری ہو گئی ہے۔

جب منوج پیدا ہُوا تھا تو پہلے ان کے ادھیکار پر سند لگی تھی۔ مذاقاً بیوی سے کہا .... "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہم خُود ہی کپڑے نِکال لیں گے۔ تُم دیکھو اپنے بیٹے کو۔ آتے ہی ہمارا بستر الگ کروا دیا اس چھٹنکی بھر لونڈے نے؟"

"چھٹنکی بھر مت کہو۔ آٹھ پونڈ کا بیٹا دیا ہے آپ کو۔"

"لیکن یہ تو بتا دو پہنے کیا؟ ہلتن صاحب کے یہاں جانا ہے۔"

"نک ٹائی تو ہرگز مت لگانا۔ بُری اُوت لگتی ہے آپ کے گلے میں۔ اسکارف لگا کے چلے جاؤ۔"

پھر پنکی پیدا ہوئی تو کُچھ اور کٹا وہُوا اُن کے ادھیکار کا۔ کھانا نوکرانی کے ہاتھ کا

Scanned by CamScanner

ملنے لگا۔ لیکن دال کا بگھار مایا خود لگاتی تھیں۔ کوئی اور لگائے تو اُنہیں پتا چل جاتا تھا۔ مایا دیوی کو بڑا فخر تھا اِس بات پر۔ ایک بار دال میں سے لمبا سا بال نکل آیا۔ لالہ جی نے نوکرانی کو نکال دیا۔ مایا سے بولے .... ''تمہارا بال ہوتا تو میں بٹوئے میں رکھ لیتا۔ لیکن اُس نوکرانی کے بال برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے کہو کام کرنا ہے تو سر مُنڈوا کے آئے۔''

''اَئے ہائے۔ سُہاگن بیچاری۔ وہ کیوں مُنڈوا دے؟ کوئی وِدھوا ہے؟''

''تو پھر کوئی نوکر رکھ لو۔''

تب سے نوکر ہی رہا گھر میں..... اب آ کے چُولہا چوکی بہُو نے سنبھالا تو ایک دن اُسے بھی کہہ دیا..... ''کھانا بناتے ہُوئے بال کھُلے مت رکھا کرو بیٹی۔ آنکھ پر آتے ہیں۔'' منی نے کس کر جُوڑا بنا لیا۔ لیکن بات مایا کی نظر سے بچ نہ سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ آج تک نوکرانی والی بات وہ بھُولے نہیں۔

دو چار روز تو بات ہنسی مذاق میں ٹلتی رہی۔ ماں دل ہی دل میں اِترا رہی تھی کہ لالہ جی اس بُوڑھاپے میں بھی عشق جتا رہے ہیں۔ روٹھے سے رہتے ہیں۔ لیکن کُچھ روز اور گذرے تو سب نے دیکھا کہ بابُو جی نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مایا بھی کُچھ بے حال ہونے لگیں۔ بُوڑھاپے کی رُوٹھائی اُنہیں جوانی سے بھی زیادہ جان لیوا لگنے لگی۔ کھانے کی میز پر سب ملتے اور لالہ جی چُپ چاپ کھانا کھا کر اُٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ سیر بھی کُچھ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ مایا نے پوچھا تو جواب دیا۔

''اب جلدی تھک جاتا ہوں۔''

ایک بے دِلی سی رہنے لگی گھر میں۔ ساتھ ہی ایک دبا دبا سا تناؤ بھی شُروع

Scanned by CamScanner

ہوگیا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے منوج نے کہا.... ''بابُو جی آپ چشمے کا فریم بدل لیجئے۔ آج کل بڑے نئے نئے ڈیزائن ملتے ہیں۔

''یہ ڈیزائن تمہاری ماں کا پاس کیا ہوا ہے بھئی۔''

''ماں کا؟'' منی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! اِنھیں گول فریم اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے چورس لے لیا۔ پھر کالے فریم پر اعتراض ہوا انھیں تو ہم نے براؤن فریم لے لیا۔''

ایک روز کھانے پر بیٹھے تو چونک کر دیکھا مایا کی طرف.... ''آج بگھار تُم نے لگایا ہے؟''

مایا کا جی بھر آیا۔ بہُو نے پوچھا.... ''آپ کو کیسے معلُوم ہُوا؟''

''ارے بیٹی تمہاری ساس کے بگھار میں اُن کے ہاتھوں کی خُوشبُو آجاتی ہے۔''

لیکن اُن کی خاموشی برقرار رہی جب دبی دبی منوائی کا بھی اثر نہ ہُوا تو منی نے ایک دن صاف صاف معافی مانگ لی.... ''مُجھ سے غلطی ہوگئی بابُو جی۔ میں اپنی ممّی کو منع نہیں کرسکی اور ممّی بھی تو مان ہی گئیں!'' وہ دونوں کو ممّی کہتی تھی۔ ماں کو بھی اور ساس کو بھی۔

ایک دبی سی مُسکراہٹ کے ساتھ بابُو جی بولے.... ''باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا۔ نا ہونے سے کوئی دُنیا اِدھر کی اُدھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے بس۔ ہم بُوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایک دُوسرے سے بیگانے تو نہیں ہوگئے۔''

اگلے دن ہی بابُو جی نے کہا.... ''میں کُچھ دن کے لئے پنکی کے پاس رہ آتا ہُوں.... ذرا تبدیلی ہو جائے گی۔''

Scanned by CamScanner

پنکی جبل پُور میں بیاہی ہوئی تھی۔ معمولی سے پس وپیش کے بعد سب مان ہی گئے۔ منوج نے تو مذاق بھی کیا..... ''ٹھیک ہے جب تک ماں کے بال بھی کچھ اور لمبے ہو جائیں گے۔''

ماں نے سمجھایا..... ''بیٹی کے ہاں زیادہ دن مت رُک جانا۔ اچھا نہیں ہوتا .... جلدی لوٹنا۔''

دُوسرے دن لالہ جی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن، چھ دن، ہفتہ گذر گیا لیکن لالہ جی جبل پُور نہیں پہنچے۔ سب کو فکر ہو گئی۔ دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں کھوج شروع ہوئی۔ خُدا نہ کرے کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ کچھ ہوتا بھی تو لالہ جی خبر کرتے۔ کوئی معقول وجہ اُن کے غائب ہونے کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہت مایُوس ہونے کے بعد پولیس کو اِطلاع دی گئی اور اخباروں میں تصویر چھاپ دی گئی.... مگر سُراغ ندارد! پریشانی اس حد کو پہنچی کہ ممکن ناممکن ہر طرح کے خیال ذہن سے گذرنے لگے۔

ڈھائی مہینے گذر گئے اور ایک دن اچانک ایک خط ملا۔ بدری ناتھ کے کسی آشرم سے.... لالہ ہیم راج بہت بیمار تھے۔ اُن کی حالت بہت نازک تھی اور آشرم کے کسی پنڈت نے اُن کی ڈائری سے پتہ لے کر خط لکھ دیا تھا۔

سب لوگ فوراً بدری ناتھ پہنچ گئے۔..... بس ذرا سی دیر ہو گئی۔ اُسی صُبح اُن کا دیہانت ہو گیا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بڑھ کے جٹائیں بن گئے تھے۔ چٹائی پر

Scanned by CamScanner

پڑے ہوئے بالکل سنیاسی لگ رہے تھے۔

مایا دیوی نے چوڑیاں توڑ کے پھینک دی اور اُن کے کان کے پاس جا کر پوچھا....

''بال کٹواؤں؟ اب تو مُنڈن کروانا ہوگا۔ ودھوا ہُوں نا!''

اور اس بار لالہ جی سے پوچھ کے بُوڑھیا نے سر مُنڈوایا....!

Scanned by CamScanner

دادا جی

دادا جی چھڑی ٹیکتے ہوئے اپنی ہمکتی چال سے چلتے ہوئے آنگن میں پڑے موڑھے تک گئے اور اُس میں دھنس گئے۔

دادا جی کے لئے تو ایک المیہ ہو گیا جو جسونت کے بیٹے کو نیچے کھینچ کر پیٹ دیا۔ پیٹا بھی کیا، بس چوتڑوں پر تین چار دھپ لگائے اور ڈپٹ کے اندر بھیج دیا۔ جب سے گاؤں آیا تھا۔ چین سے بیٹھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی شرارت کوئی نہ کوئی ہجت!

ابھی پرلے دن کی بات ہے، گاؤں کے لونڈے بیرو کے ساتھ تالاب میں پتھر کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ شہر میں کہاں یہ کھیل دیکھا ہوگا۔ یہ گھوڑے تو گاؤں کے تالاب ہی میں کود سکتے ہیں۔ سمندر میں تھوڑا ہی کود دیں گے۔ کسی ٹوٹی کنی، مٹکے کی ٹھیکری کو گھس کے گول کرنا، یا چپٹا سا کوئی پتھر جو بھاری نہ ہو، اُسے تالاب کی سطح پر یوں پھینکنا کہ تین چار

پتے لگاتا ہُوا جائے اور جا کے ڈوب جائے پانی میں۔ بیرو کو مشق تھی۔ پانچ چھ کبھی سات سات پتے بھی لگا لیتا تھا۔ بنّی کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ چینی کی پلیٹیں توڑ کے ٹکڑے لے گیا۔ چکنی ہے اس لئے، سوچا ڈور تک جائے گی۔ بیرو دھوبی کا لونڈا، روز کپڑے لینے آتا تھا، اُس نے شکایت کر دی۔ دادا جی نے سمجھایا!

''بیٹا ان گھوڑوں کے لئے گھر کے برتن نہیں توڑا کرتے!''

بنّی نے تالاب پہ لے جا کے بیرو کو دھکا دے دیا پانی میں۔ وہ تو گاؤں کا تھا، تیر کے لوٹ آیا۔ بنّی نے کہاں سیکھا تھا تیرنا۔ جھگڑا ہو گیا اور خود ڈوبتے ڈوبتے بچا۔

لیکن آج صبح کی پٹائی پہ تو وہ دادا جی سے بالکل ناراض ہو گیا۔ چٹھی پتر کا زمانہ تو گیا۔ جسونت نے گھر میں فون لگوا دیا تھا۔ بنّی نے فون کر دیا۔ اور جسونت نے کہہ دیا کہ آ کے لے جائے گا۔ باقی چھٹیاں وہ شہر ہی میں کاٹ لے گا۔

دادا جی بہت پریشان تھے۔ مایوس بھی تھے۔ اور سچ بھی ہے کہ اولادیں ہو جائیں تو اپنے آپ ماں باپ سے موہ کم ہو جاتا ہے۔ اولاد سے بڑھ جاتا ہے۔ جسونت کو تھوڑا ہی یاد ہو گا جب بارش میں ننگے پاؤں باہر جانے کی ضد کی تھی۔ اور ڈانٹ پڑی تھی۔

''چلو، پہلے بُوٹ پہنو!''

ماں سے ڈانٹ برداشت نہ ہوئی تھی، سو اٹھا کر باہر لے گئی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اُسے کیسے بتاتے کہ اُن سے چھوٹی اُسی طرح ضد کر کے بارش میں نکل جاتی تھی، اور پتہ

Scanned by CamScanner

نہیں کب پولیو کی شکار ہوگئی۔ دایں ٹانگ سُوکھ گئی۔ پولیو کی ماری بیٹی کی شادی کرنے کے لئے اُن کے ماں باپ کو کیا کیا جتن کرنے پڑے تھے۔ ان کے تجربے اتنے جمع ہوگئے تھے کہ ایک ایک بات پر کہانی کھُل جاتی تھی۔ تجربے بولیں نہیں، بانٹیں نہیں تو کیا کریں؟ اُسی کا نام تو بزرگی ہے۔

جسونت بھی اسی سے پریشان رہتا تھا۔ بڑودہ بینک سے جب ریٹائر ہوئے تب گاؤں میں پشتینی گھر کا خیال آیا۔ جسونت ہی نے کہا تھا کہ سکول کے زمانے تک تو گاؤں جاتا رہتا تھا اپنے دادا جی سے ملنے، لیکن اب تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

''آپ ہی چلے جائیے۔ اور جو مناسب سمجھیں کیجئے اُس گھر کا۔ ویسے بھی آپ کی پینشن سے شہر میں رہ کر تو گذارہ کرنا مشکل ہے۔ اور اب بنٹی بھی سکول جانے لگا ہے۔ خرچے تو بڑھتے ہی جا رہے ہیں!''

اُس کا مطلب تو وہ سمجھ گئے تھے۔ لیکن بنٹی سے بہت لگاؤ ہوگیا تھا۔ پتنی کے گذر جانے کے بعد پوتے کے ساتھ ہی وقت کٹتا تھا اُن کا۔ وہ اپنے کرکٹ کے قصے سُناتا تھا اور وہ اپنے گلی ڈنڈے کے ___!

جسونت کی پتنی جب دوسری بار حاملہ ہوئی تو وہ دل کڑا کر کے گاؤں چلے آئے۔ لیکن گاؤں آتے ہی من ہرا ہوگیا۔ جیسے پودے کو اپنی جڑوں کی مٹی مل گئی ہو۔ اُنہیں اپنے دادا جی کے دن یاد آنے لگے۔ سچ تو یہ ہے جتنا اُنہیں ملا تھا بڑا ہوتے ہوئے، اُن کی

Scanned by CamScanner

اولادوں کو کہاں ملا۔ اُن کے پتا پیدل چل کر، چار کوس دُور مدرسے جایا کرتے تھے۔ وہ خود سائیکل پر بڑے سکول گئے تھے اور پھر شہر کے ہوسٹل میں رہ کر کالج پاس کیا تھا۔ پھر بھی دیسی گھی کا کنستر اور میوے کی بھری پٹیاں گھر سے بھر کے لے جایا کرتے تھے۔ یہ پُشتینی مکان بڑے دادا جی نے بنوایا تھا اور پھر اُن کے پتا کے زمانے تک اُسے بڑھتے دیکھا تھا۔ اُوپر کی چھت اُن کے سامنے پڑی تھی۔ اِسی برساتی میں سگریٹ پینا سیکھا تھا اور اِملی کی چھڑی سے پٹائی ہوئی تھی۔ وہیں عشق ہوا تھا۔ اُسی پرنالے سے لٹک کے گھر سے بھاگے تھے۔ جسونت کو تو گھر سے بھاگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ اُسے پیار ہوا تو ایک روز لڑکی کو لا کر ماں سے ملا دیا اور اِرادہ ڈیکلئر کر دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ تو جسونت کو بھی پڑی تھی لیکن کبھی مارا ہوا نہیں یاد نہیں ___ پھر آج بنٹی کو کیسے پیٹ دیا ___ ؟

جسونت کے آنے سے بنٹی اور بھی وِٹھر گیا۔ دادا جی سے بات ہی چھوڑ دی اُس نے۔ جسونت نے سمجھایا بھی لیکن اُس کی ہٹ نہیں گئی۔

صبح چلتے وقت، جسونت نے پھر کہا۔

''چلو، دادا جی کے پاؤں چھوؤ!''

بنٹی نے مُنہ موڑ لیا۔ دادا جی خود ہی پاس گئے۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ لاڈ کیا۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔

''مجھ سے بات نہیں کرے گا؟''

''نہیں!''

''کیوں؟''

Scanned by CamScanner

''مجھے پیڑ سے نیچے کھینچ کے مارا کیوں؟''

ذرا سا تامّل کیا دادا نے۔ پھر بولے

''میں نے تجھے تھوڑا ہی مارا تھا بیٹا۔ میں نے تو کسی اور ہی کو مارا تھا۔''

ہنّی نے آنکھ بھر کے دیکھا۔

''جھوٹ!''

''ہاں بیٹا۔ میں نے تو اُس لڑکے کو مارا تھا۔ جس نے اُس پیڑ سے گر کر اپنی ٹانگ توڑ لی تھی۔ یہ دیکھ ___''

دادا جی نے چارپائی پہ بیٹھ کے اپنا پائنچہ اُٹھایا اور بائیں پنڈلی کی ہڈّی پر لگا زخم کا نشان دِکھایا۔ اور کہا۔

''دیکھ! میں تب تیری ہی عُمر کا تھا۔ اِسی لئے آج تک لنگڑا کر چلتا ہُوں!''

اور لنگڑاتے ہوئے اُسے باہر کھڑی ٹیکسی تک چھوڑنے چلے گئے۔

Scanned by CamScanner

ایڈجسٹمینٹ

(Adjustment)

غلطی ہوئی ہم سب سے جو نانا کو نانی کی میّت پر نہیں لے گئے۔

چند ماہ پہلے اُنہیں غشی کا دَورہ پڑا تھا، اِس لئے ڈرتے تھے، کہیں اُنہیں کچھ ہو نہ جائے۔ ایک صدی رہے تھے جس کے ساتھ، کیوں اب مَری کا مُنہ دیکھیں۔ وہ بھی مان گئے۔ کہہ دیا:

''لے جاؤ۔ کہہ دینا۔ میں بھی آرہا ہوں۔ تُم چلو!''

بھاری دل سے ہم اَرتھی اُٹھا کر لے گئے۔ ایک بار مُڑ کے دیکھا تھا میں نے۔ بالکنی کا دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے تھے۔

نانی تین برس چھوٹی تھیں نانا سے اور تین برس پہلے گُزر گئیں۔ نانا بہت ضعیف تھے۔ چُراسی پچاسی پار کر رہے تھے، تب بھی نوک جھونک ایسے چلتی تھی کہ جیسے نئے نئے بیاہ

Scanned by CamScanner

کے آئے ہوں۔ کبھی کبھی رُوٹھائی بھی ہوجاتی تھی جو کئی دنوں تک چلتی۔ ہم کبھی کچھ بول دیتے بیچ میں تو نانا کہتے:

''ہوتا ہے بیٹا۔ ہوتا رہتا ہے۔ آپسی اڈجسٹمینٹ (Adjustment) میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔''

اب اور کتنا وقت لگنا تھا۔ بائیس پچیس کے تھے جب شادی ہوئی تھی۔ ساٹھ اِکسٹھ برس کاٹے شادی کے۔

''اجی کیا کاٹے۔ بیس برس تو بانجھ رہیں۔ جب ہری ہوئیں تو ایک بیٹی دے کے پیٹ کٹوالیا۔''

نانا کی باتیں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ماں اکثر ڈانٹ دیتی تھی۔

''تمہیں لوگ اُکساتے ہو اُنہیں بولنے پر۔ اور سُننی پڑتی ہیں ماں کو!'' یعنی ہماری نانی کو۔ وہ تو بس پوپلے سے مُنہ سے کچھ بول دیتی تھیں۔

''دو نواسے ہیں خیر سے۔ اب تو چُپ ہوجاؤ!''

نانا چُپ تو ہوجاتے۔ لیکن آنکھوں سے کچھ نہ کچھ بول دیتے تھے۔ جو وہی سمجھتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لمبی ٹیس سُنائی دیتی اُس میں!

ہم دونوں بھائی چھوٹے تھے جب ہمارے پِتا جی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اور نئی ماں کو بھی اکثر اُس گھر میں لے آتے تھے۔ ماں سے کچھ بن نہیں پڑا، تو نانی لڑ جھگڑ

Scanned by CamScanner

کے ہم دونوں کو اُٹھا کر چلی گئیں۔ ماں سے کہہ دیا:

''تجھے مرنا ہے تو مر اپنے کھسم کے پاس۔ بچّوں کو تو میں سوتیلی کی مار نہیں سہنے دوں گی۔''

شاید نانا خوش نہیں تھے اس پر!

''اپنی تو آئی نہیں۔ دوسروں کی اولادیں اُٹھالائی۔ کون پالے گا انہیں؟''

کچھ ہی سالوں میں، جب دوسری ماں سے اولاد پیدا ہوئی، تو ہماری ماں بھی یہیں چلی آئیں۔ نانا اور چوگئے۔ ماں اُن کے سامنے آئے تو مُنہ موڑ لیتے تھے۔ نانی نے کوشش بھی کی منانے کی، لیکن اُن کی ضد نہ ٹوٹی۔ کوئی کام ہو، کہنا ہو تو، ہمیں جاتے تھے سامنے۔ ماں کبھی نہ گئی۔ اُن کے سامنے اگر کچھ چلتی تھی تو نانی کی اور کہتی بھی تھیں:

''جس دن میں نہ رہی، اُس دن دیکھنا.... ان بچّوں کی ماں سے بات نہیں کرتے ناں۔ یہ بھی نہیں کریں گے۔ اکیلے بالکنی میں بیٹھ کے دُھوپ کھانا۔''

نانا دھیرے سے بول دیتے!

''تجھ سے بڑا ہوں۔ دیکھتا ہوں پہلے کون جاتا ہے؟... تُو کہ میں!''

نانی بڑی بوڑھیوں کی طرح کان نہ پکڑتیں، زبان نہ کاٹتیں، کہہ دیتیں:

''دیکھ لینا!''

اور نانی سچ مچ پہلے چلی گئیں۔ نانا اور چڑچڑے ہو گئے۔ جیسے کوئی شرط ہار گئے ہوں۔

کچھ روز کھانے سے رُوٹھ گئے۔ ''اُسے کہہ دو، نہیں کھاتا!''..... کمرے سے

باہر بھی نہیں نکلے۔ کچھ چیزیں ہٹا کر، کمرہ آراستہ کیا۔ لیکن نانی کا پلنگ کمرے سے ہٹانے نہیں دیا۔ خشک سی آواز میں کہا تھا۔

''رہنے دے۔ اور کہاں سوئے گی؟''

جس روز استھیاں لے کر جانی تھیں۔ اُس روز بھی اپنے کمرے ہی میں بند رہے۔ میں اندر گیا تو نانی کے بستر پہ بیٹھے تھے۔ کلسی کو بس ہاتھ سے چھوا اور کہا:

''لے جاؤ۔ ساری عمر بس لڑتا ہی رہا مجھ سے۔''

اُس دن یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ بہت دن بعد سمجھ آئی۔

ایک دن اور دیکھا نانی کی کھانسی کا 'سیرپ' پڑا تھا۔ وہ پی رہے تھے۔ شیشی کے ڈھکن میں ناپ کر، بالکل جیسے نانی لیتی تھیں۔ میں نے پوچھا بھی!

''یہ کیوں لے رہے ہیں آپ؟''

''کیا کروں؟... یہ کھانسی موئی گلا ہی نہیں چھوڑتی!'' نانی کا ہی جملہ تھا۔ پھر بولے:

''یہ ختم ہو جائے تو دوسری شیشی لا دینا۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ اُنہیں کھانستے کبھی نہیں سُنا تھا۔ لیکن زیادہ حیرت تب ہوئی جب میں نے ایک روز کہا:

''نانا چلو۔ چل کے بال کٹوا آئیں، بہت بڑھ گئے ہیں۔''

نانا نے مُنہ موڑ لیا۔ میں نے پھر پوچھا۔

''کہیے تو نائی کو یہیں بُلوا لُوں۔ گھر میں آ کے کاٹ جائے گا۔''

Scanned by CamScanner

اُسی طرف دیکھتے ہوئے مُنڈی ہلادی اور بولے:

''نہیں۔اُنہیں میرے چھوٹے بال اچھے نہیں لگتے۔وہ تو مار ہی ڈالے گا مجھے۔''

اُن کا انداز بالکل نُسوانی تھا۔جیسے نانی بول رہی ہوں۔میں لوٹ گیا۔کچھ گھبرایا سا۔ماں سے ذِکر کیا تو بولیں:

''آج کل ماں (نانی) کو بہت یاد کرتے ہیں۔اُن کی تصویر سے باتیں کرتے دیکھا ہے میں نے۔اور رات کو سوتے بھی اُنہیں کے بستر پر ہیں۔''

لیکن ماں چونکیں اُس دن جب نانا کا دل پسند رائتہ بنا کر لے گئیں اور نانا نے یہ کہہ کے لوٹا دیا۔

''جانتی نہیں میں رات کے وقت رائتہ نہیں کھاتی۔میرا گلا پکڑ لیتا ہے۔''

اُن کا مصدر بھی بدل رہا تھا۔وہ عورت کے لہجے میں بات کرنے لگے تھے۔

میری فکر بڑھ گئی۔میرے ایک دوست ہیں۔ڈاکٹر۔ڈاکٹر کے۔ڈی۔کامبلے۔Psychiatrist ہیں۔اُنہیں گھر بُلا لیا۔

بہت دیر تک نانا سے باتیں کرتے رہے۔زیادہ وقت تو وہ چُپ رہے۔کوئی جواب نہیں دیا۔اور جواب دیا بھی تو نانا کی ہی صورت۔لیکن اُس میں ایک اور بات پوشیدہ تھی، جو ظاہر ہوئی۔ایک سوال کے جواب میں بولے:

''یہ وہی بتا سکتی ہے ابھی آئے گی تو پوچھ لُوں گا۔''

کامبلے نے پوچھا: ''کہاں گئی ہیں؟''

Scanned by CamScanner

وہ مسکرا کے بولے: ''مجھے بتاتی تھوڑی ہے۔''

جب اُٹھے تو ڈاکٹر کامبلے نے بتایا:

''اُن کے حساب سے نانی گزری نہیں ہیں۔ اب وہ دوہری زندگی جی رہے ہیں۔ شاید اکہری زیادہ۔ وہ خود کو نانی سمجھنے لگے ہیں۔ جو ہوتا ہے اب نانی کو ہوتا ہے۔ پیاس لگتی ہے تو نانی کو۔ درد ہوتا ہے تو نانی کو۔ دوا بھی اب وہی کھاتی ہیں۔ وہ صرف نگلتے ہیں۔ اُن کے لئے۔''

میں ڈاکٹر کو چھوڑنے اُن کے گھر تک گیا۔ کامبلے نے بیماری کا نام بتایا۔

''Dys morphic phobia'' ! اور کہا۔

''لیکن اس کا کوئی یقینی علاج نہیں ہے۔ کوشش کرتے رہنے سے کچھ حواس کبھی کبھی واپس بھی آجاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بغیر کچھ کئے بھی آدمی اس کیفیت سے باہر آجاتا ہے۔ لیکن اس عمر میں شاید مشکل ہو!''

ڈاکٹر کے گھر رُک کر میں نے ایک ڈرنک لی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات کی۔ اور چلنے سے پہلے کامبلے نے مجھ سے پوچھا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ اب وہ نانی ہوں یا نانا۔ تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟... وہ نانا کہہ کے رائتہ کھائیں یا نانی کہہ کے نہ کھائیں۔ ذرا اٹ پٹا ضرور لگتا ہے۔ لیکن اُنہیں جینے دو۔ جیسے بھی جیتے ہیں۔''

رات کو لوٹتے ہوئے دیر ضرور ہوگئی، لیکن کامبلے کی بات سُن کر، جی ضرور ہلکا ہوگیا۔ فکر کم ہوگئی۔ سوچا جیسے نانا نے نانی کے ساتھ ایڈجسٹمینٹ (Adjustment) کرلی

Scanned by CamScanner

ہے۔ہمیں بھی نانا کے ساتھ کر لینی چاہیئے۔

گھر آیا تو رچنا نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔میں نے پوچھا تو بتایا کہ نانا بھی بغیر کھائے ہی سو گئے۔

''ایک بار پوچھ لو۔ایسا نہ ہو رات کو بھوک لگے اور ہمیں جگانا پڑے۔''

میں ہی جگانے چلا گیا تا کہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ کر کچھ کھالیں۔کمرے میں گیا تو وہ نانی کے بستر پر ہی سو گئے تھے۔میں نے چادر ہٹا کر جگانا چاہا تو بھونچکا رہ گیا۔وہ نانی کی دھوتی بلاؤز پہنے سو رہے تھے!

Scanned by CamScanner

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

Scanned by CamScanner

رزق تو قدرت پتھر کے کیڑے کو بھی مہیا کرتی ہے۔ تو رزق کمانے کے کتنے راستے ان کے لئے کھلے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا گذارہ سیاسی لیڈروں کے جلسوں پر ہے۔ سامعین میں شامل ہو کر جلسے کی رونق بڑھاؤ اور لیڈر کے حق میں نعرہ لگاؤ۔ ایک نعرہ ایک اٹھنی۔

پوچھتا ہے "بھاؤ تم سارا حساب اٹھنیوں میں کیوں رکھتا ہے۔"

بھاؤ ادھا ہنس کے بولا "اپنے جیسے کومن مین کے پاس سب کچھ آدھا ہی سچ ہوتا ہے۔ آدھا کھانا' آدھا' پینا' آدھا سونا' آدھا ہنسنا' آدھا رونا' آدھا جینا' آدھا سچ مرنا'.... یہ اٹھنی سالا کبھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔"

خاک میں پڑی اس رنگا رنگ مخلوق کا بیان اتنی جزئیات نگاری کے ساتھ ہے اور اتنے بے ساختہ انداز میں کہ یہ سب لوگ جیتے جاگتے ہماری نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔ بیان کی سادگی اس پر مستزاد۔ بلکہ ان کہانیوں کا ایک بڑا وصف یہی سادہ بیانی ہے۔ تجریدیت پسندوں نے کہانی کو معمہ بنا دیا تھا۔ گلزار صاحب نے کہانی کو پانی کر دیا۔ شاعری میں ایسے سہل اشعار کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ گلزار نے کہانی کو سہل ممتنع کر کے دکھایا ہے۔

حسین

KN-722-642

Rs.

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2678-3
ISBN-13: 978-969-35-2678-3
9 789693 526783

Scanned by CamScanner